

ابن انشا

آوارہ گرد کی

ڈائری

سفر نامہ

لاہور اکیڈمی

چوک اردو بازار لاہور

فون نمبر ۶۴۲۲۸

جسٹہ حقوق محفوظ

طبع اول : جولائی ۱۹۷۱ء

طبع دوم : جولائی ۱۹۷۲ء

طبع سوم : ستمبر ۱۹۷۳ء

طبع چہارم : نومبر ۱۹۷۶ء

طبع پنجم : مارچ ۱۹۷۸ء

قیمت : ۱۵ روپے

ناشر : سرزاد محمود چودھری

مطبع :

سَرَدے

مارک ٹوین نے اپنے ایک ناول کے دیباچے میں لکھا تھا :

’اگر کوئی شخص اس کہانی میں مقصد تلاش کرتا ہوا پایا گیا تو
اس پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ اگر کسی شخص نے اس کتاب
سے سبق لینے کی کوشش کی تو اسے ملک بدر کر دیا جائے گا
اور اگر کسی نے اس میں چٹا ٹماش کرنے کی جرات
کی تو اسے گول مار دی جائے گی۔‘

ہم طبیعت کے ایسے متشدد نہیں ہیں جیسے مارک ٹوین تھے۔ تاہم اتنا خبردار
کریں گے کہ اگر کسی نے اس سفر نامے سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو یہ اچھا
نہ ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص اس سفر نامے کو گائیڈ بنا کر اس کی مدد سے سفر کرنے کی
کوشش کرے گا، نتائج کا خود ذمہ دار ہوگا۔ اصل میں یہ اس مضم کا سفر نامہ نہیں، جو
سفر کے اختتام پر لکھا جاتا ہے۔ یہ تو ایک ادارہ گرد کی ادارہ ڈائری کے منظر اور اوراق

ہیں۔ ۱۹۶۷ء کے اواخر میں ہم یونیسکو کی دعوت پر یورپ اور مشرق وسطیٰ کے ملکوں کے دورے پر گئے تھے۔ وہاں جو کچھ ہم پر اور ان ملکوں پر ہمارے اقصیٰ گزرتی رہی بے کم و کاست رقم کو کے اجزاء میں بھیج دیا کرتے تھے پھل قسط میں کیا لکھا تھا۔ یہ کبھی یاد نہ رہا۔ چونکہ ہمیں جبر رخصت کی کبھی عادت نہیں رہی لہذا جو رہ گیا سو رہ گیا۔ شفا چکیو سکسویکیا کی راجدھانی پرائی میں ہم نے جو چار بوسہ میں دن گزارے وہ یادگار دن تھے۔ سوچا ان پر ذرا بیٹھ کر دیکھنی سے لکھیں گے۔ سو یہ نہ ہوا۔ وہ دن کبھی نہ آیا۔ دارما کی یاد ترائی روداد بھی نہ لکھ سکے کہ اب کون لکھے۔ یہی حال دوسرے (سوئٹزرلینڈ) کے احوال کا ہے۔ اب تو ان کی یادیں سپنوں کے سماں ہیں۔

ہمارا یہ سفر پورے تین مہینے کا تھا۔ ایک مہینہ لندن میں۔ دو ہفتے جرمنی میں اور باقی ایام میں باقی دیار و امصار۔ یونیسکو کا روزانہ جتہ ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی شخص کسی اپنے ہوٹل میں ٹھہر سکے اور کام و دہن کی معقول تواضع کر سکے۔ خاتمہ یہ کہ مسافر میں تن آسانی پیدا نہیں ہوتی۔ ریاضت اور مجاہدے کے معنی سے آشنا ہو جاتا ہے۔ پیدل چلتا ہے اور بسوک رکھ کر لکھاتا ہے (اگر لکھاتا ہے تو) اس کا صحت پر بڑا اچھا اثر پڑتا ہے ہم بھی اپنے بدن کے ۲۰ پونڈ ٹھساکر لوٹے تھے۔ شاید یونیسکو کا منشا بھی یہی تھا۔ جو تا بھی ایک گھس گیا۔ دوسرا خریدنا پڑا۔ ایک بات ہے اب ان چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں نے جن میں بعض کے دو دروازے اوڑھنے سے کھلتے بند ہوتے تھے اور ان کے غسل خانوں نے ہمیں لکھنے کا مواد بہت کچھ مہیا کیا۔

بارہ ولایتوں اور تیس شہروں کا یہ سفر بہت سے اور سفروں اور آوارگیوں کا نقطہ آغاز ثابت ہوا لیکن ان کی داستان طویل ہے اور چونکہ مشرق بعید امریکہ اور یورپ سب کو محیط ہے اس لئے اس کا نام ہم نے دنیا گول ہے تجویز کیا ہے یہ پڑھنے کے بعد بھی چاہے تو اسے بھی پڑھیے۔

ابن انشا

۲۶ مئی ۱۹۷۱ء

اس کتاب کے کارٹون جمشید جمشید انصاری نے بنائے ہیں۔ البتہ پیرس کے باب میں جن کارٹونز کے نیچے ماحول کیا ہے وہ ڈیوڈ لینڈن کے ہیں۔ غیر کارٹونی نقوش دوسری جگہ سے لئے گئے ہیں۔

ترتیب

پیرس ۱۰۔ پیرس کا برٹل ۱۳۰
 آنا ٹو بریڈ کا مرزا نسیم جیک کے ٹھہرا ۱۹
 متفرقات پیرس ۲۹۰

لسدن نندن سے ایک خط ۳۷۰
 کچھ قصہ دہل چاتی کا ۵۱۰
 کچھ چکھوتیاں کچھری ۵۲۰
 ٹاڈر سے نوم ٹھہر تک ۶۵۰
 گوبے دیکھے کالے دیکھے ۳۰
 بیانِ نعتِ آوار گ کا ۸۱۰
 نقابِ عاشقان سے لھکوں شریف تک ۸۸۰
 اے بشیر! اے بشیر! ۹۵۰

جرمنی

اب ہم قریلیگٹ میں ہیں ۱۰۹۰

ہم جرمن زبان پر جاری ہو گئے ۱۱۱۰

کھانا ہمارا سیب ۱۱۹۰

آنا برلن اور ٹھہرا ہوٹل کفرستان میں ۱۲۳۰

برلن مارا اور منشی جی کا ۱۳۵۰

رائٹ برادران سے رجب ملی سرور تک ۱۴۴۰

ہالینڈ

کوہ دہرمن، ابریز کی چوٹی پر، ۱۵۵۰

ہالینڈ ہم کو پسند آیا، ۱۶۱۰

ہالینڈ کے راستوں میں تنہا، ۱۶۷۰

ہمیں بھی آرٹ سے رغبت ہے ۱۷۷۰

سوئٹزرلینڈ

ہوٹل ساں ساں ساں ۱۷۷۰

گھوٹا اکاڈٹ سوئٹزرلینڈ میں ۱۹۳۰

ہم جینوا سے چل دیئے، ۲۰۳۰

برن کی سحر جبری رات، ۲۱۱۰

زیورخ تک راستہ ٹھنڈہ ۲۱۵۰

شامت اعلیٰ ماصورت پیرس گرفت ۲۲۹۰
 ڈوبی و ہونٹ کی ریس کوں جیتا ۲۳۶۰

پھر پیرس

وینا ہم دینا پہنچتے ہی ڈی ویو ہر گئے ۲۳۵۰

وینا

دکھائیے سے جا کے تجھے مھر کا بازار ۲۵۷۰
 اہرام کے سائے میں ۲۶۵۰
 خان خلیل کی ایک شام ۲۷۳۰

قاہرہ

لبنان و شام
 بیروت کی باتیں ۲۸۲۰
 دمشق میں عشق ۲۸۹۰
 ایک شام انصی کی محرابوں میں ۲۹۷۰
 جو نیہ سے طراہیں تک ۳۰۵۰
 چل خسرو گھراپنے ۳۱۳۰

لبنان و شام

پیرس

۶ ستمبر تا ۱۳ ستمبر ۱۹۶۴



یہ پیرس کا ہوٹل مالار ہے

یہ پیرس کا ہوٹل مالار ہے۔ اس وقت جبکہ ہماری جہاں گردی پر رشک کی نگاہ کرتے دے کراچی میں اپنے خوانوں پر تر لٹے اڑا رہے ہوں گے، یہ آوارہ کوئے تباہ آوارہ تر بادا پنیر کے بد مزہ اور سخت سینڈ وچ کھا کر بیٹھا اور نمک سلیمانی پھانک رہا ہے۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ پیرس جانے والا جاتے ہی پریوں کے جھرمٹ میں گھر جاتا ہے اور اس کا دن عید اور رات شب برات ہوتی ہے، انھیں یہ جان کر اطمینان ہونا چاہیے کہ ابھی ہم مین بھر کی گزرش کے آبلے پھوڑ کر بیٹھے ہیں، دل کے پھپھو لوں کی باری آتی معلوم نہیں ہوتی۔

ہوٹل مالار کو پیرس کا لمباری ہوٹل کہہ لیجئے تو مضائقہ نہیں۔ وہی ہیبت وہی شوکت، وہی شان و لاری۔ یہاں ہمیں گھر کا سا آرام میسر ہے۔ اس کے غسل خانے میں ہمارے گھر کی طرح پانی کم کم آتا ہے۔ بلب کی روشنی خاص طور

پر اس لئے دھیمی رکھی گئی ہے کہ کوئی راتوں کو پڑھ پڑھ کر اپنی آنکھیں خراب نہ کرے۔ باتھ روم ایسی تنگنائے غزل ہے کہ ہم نے وزارتہ کھول تو یا لیکن بدن پر صابن نہ لگا سکے، کیونکہ ہمارے قاریتین میں سے جو صاحبان کبھی نہلتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ صابن لگانے کے لئے کہنیوں اور گھٹنوں کو حرکت دینی پڑتی ہے اور اس حمام بادگردی دیواریں اس قسم کی عیاشی اور خوش فعلی کی گنجائش نہیں رکھتیں۔ ایک اور بات اس ہوٹل میں ہمارے گھر کی سی یہ ہے کہ یہاں کوئی ہماری بات سنتا نہیں۔ سنتا ہے تو سمجھتا نہیں۔ اور سمجھتا ہے تو جواب نہیں دیتا۔

ہمارا یورپ کا یہ پھیرا پورے چھ سال بعد پڑ رہا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں ہی دن تھے بلکہ عجب اتفاق ہے کہ ستمبر کی پانچویں ہی تھی جب ہم نے کراچی سے اڑان کی۔ اس وقت بھی ہم چار روز کوپریس میں اترے تھے اور پریس کی دیدنی چیزیں دیکھ لی تھیں۔ لیکن اب تو ان کی مادیں ایک خواب کے سان ہیں۔ آج شام ہم اٹل ہاؤس کی طرف جانکے تو پھر آسمان چھوٹنے کو جی چلا سر لیکن فقط دوسرے مائے تک جا سکے۔ تیسرا کسی وجہ سے بند تھا۔ ۱۹۶۱ء میں یہ تنہائی کا عذاب نہ تھا ہم دو آدمی تھے۔ غریباری ہر چند کہ اس وقت بھی اسی طرح کرتے تھے کہ انٹلی سے اسٹار کیا۔ یہ یہ اور وہ۔ اس کے بعد مٹھی بھر پیسے نکال کر آگے کر دیے کہ سے نو جتنا بی چاہے۔ دو آدمیوں کے ہمہ وقت ساتھ رہنے کا مطلق ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ کل ہمارے دوست ہاشم نے کہ سفارت خانے میں پریس آٹاشی ہو کر آئے ہیں ہمیں دال بہات کھلا دی تھی لیکن پرسوں رات ہم پر عجب اجوا گزرا۔ ہوا یہ کہ



سید ولی اللہ نے جو چھ سات سال سے پیرس میں ہیں، ہمیں فون کیا کہ کھانا
 یہیں کھاؤ آج کی رات۔ میں آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تھیں ہوٹل سے آؤں گا۔
 ہمیں یہ بات کچھ پسند نہ آئی کہ وہ کھانا بھی کھلاتیں اور لینے بھی آئیں۔ لہذا
 عذر کر دیا کہ اس وقت ایک اور صاحب نے تحفہ کی دعوت کر رکھی ہے۔ ہاں
 جانا ہے، آپ کے ساتھ تو گھر کا سامعہ ہے۔ پھر کبھی سہی۔ انھوں نے فرمایا:
 اچھی بات۔ میں مجبور نہیں کرتا۔

ہم نے شہر کا نقشہ ہاتھ میں لیا اور شانزائیزے کی راہ پکڑ لی۔ خاصا لمبا
 چکر پڑا اور محراب فتح تک پہنچتے پہنچتے کچھ سردی نے اور کچھ بھوک نے ہرا دکھانا
 شروع کیا۔ شانزائیزے پر کہ پیرس کی مال روڈ ہے، ہوٹلوں اور کیفوں کی کمی نہیں۔
 ہم نے ایک دو کو ٹھک کر دیکھا۔ گائیڈ بک کے حوالے سے معلوم ہوا کہ وہاں
 ایک وقت کا کھانا سترے نوے فرانک تک قیمت پاتا ہے۔ سینڈویچ وغیرہ
 لئے جا سکتے تھے لیکن ایک تو سوڈ کے قتلوں کا دور دوسرے جہاں نگاہ کی شراب
 کے شیشے تو ضرور نظر آئے، چائے کافی کا سامان دکھائی نہ دیا۔ یاد رہے کہ یہاں
 شراب پانی سے سستی ہے۔ سادہ پانی کی بوتل ایک روپے میں آتی ہے شراب
 کا جام چھ آنے آٹھ آنے میں۔ اپنی جیب کو دیکھتے ہوئے تو ہمیں نے ہی پینی
 چاہیے۔ لیکن عادت کا کیا کریں۔

قرض کا پیتے ہیں پانی پر سمجھتے ہیں کہ اں
 رنگ لئے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

خیراجی میں یہی ٹھانی کہ محراب فتح سے اپنے گھر کا سُخ کرو اور لگی کے
 کوٹے پر جو کیفے ٹیریا ہے، وہاں سینڈوچ کھاؤ کافی پیو اور پیٹ پر ہاتھ
 پھیرتے ہوئے سو جاؤ۔ سو اتفاق سے ہم راستہ بھول کر کہیں کے کہیں جا نکلے
 اور اپنی گلی تک آتے آتے ساڑھے نو کا عمل ہو گیا۔ دیکھا کہ وہ کیفے بند ہے۔
 دُور دور تک اور بھی کوئی دکان کھلی نظر نہ آئی۔ چند قدم پر ایک مٹھائی بسکٹوں
 والے کا اسٹور تھا۔ وہ بھی بند نکلا۔ ایک ٹکڑ پر فقط ایک تبا کو سگرٹوں والے
 کا کہیں کھلا تھا۔ لیکن ماکولات میں سے کوئی چیز اس کے پاس بھی نظر نہ آئی۔
 اب بھوک خوب چمک گئی تھی اور اتنی لمبی کالی رات سامنے تھی۔ سو چاکہ ہوٹل کی
 خادمہ سے کہیں گے کہ بی بی ہمیں ایک کپ کافی کا بنا دو اور ہو سکے تو ناشتے
 کے لئے جو ڈبل روٹی آئی ہوگی اس میں سے کچھ کھن یا جام کے ساتھ عنایت
 کرو۔ جان و مال کو دعائیں دیں گے۔ لیکن وہ عقیقہ اس وقت برتن لوندھائے
 ٹیلی ویژن دیکھنے میں مصروف تھی۔ ہم نے کچھ دیر تو قفت کیا کہ پروگرام ختم ہو
 لے، لیکن وہ تو کوئی لمبا ڈراما چل رہا تھا۔ ہم نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول
 کرنے کے لئے سلام بھی کھینچ مارا۔ اور یہ بھی کہا کہ ہمارے کمرے کی تہی خراب
 ہے۔ لیکن اس نے ٹیلی ویژن سے دھیان ہٹاتے بغیر حکیم السلام کہہ دیا اور
 یہ کہ تہی کی بات کل دیکھی جائے گی۔

اب ہم چھاپنے کمرے میں آئے اور کندھی لگا کر سوچنے لگے کہ کیا کھایا جائے
 شاید کوئی ٹائی وغیرہ کوٹ کی جیب میں ہو۔ نہیں۔ کوئی نہیں۔ پانی ضرور

دھرا ہے، لیکن وہ تو پانی ہے۔ ہم اپنے ساتھ کراچی سے اگر کھانے کی کوئی چیز لے کر چلے تھے تو وہ دو شیشیاں کارمینا کی تھیں اور ایک نمک سلیمانی کی۔ دو ٹکیاں کارمینا کی کھائیں لیکن وہ سونے پر سہاگہ ہو گیا۔ اے کاش حکیم سعید نے بھوک پر ٹھانے کی بجائے بھوک مٹانے کی گولیاں بنائی ہوتیں۔

اب ہم بستر پر سیدھے بیٹھے ہیں اور سوچ رہے ہیں۔ کب صبح ہوا اور ناشتہ ملے۔ لیکن ابھی تو دس بجے تھے۔ آخر یاد آیا کہ پی آئی اے والوں نے چھوٹا سا سونف کا ایک پکیٹ دیا تھا۔ کوئی قولہ بھر سونف اور دو تین دلنے اس میں چھالیا کہے۔ ڈھونڈنے پر نکل آیا۔ ہم نے اس پر دانت تیز کئے۔ سونف تو بچائے خود اشتہا افزا ہے۔ لیکن چھالیا کام کی چیز نکلی۔ معدے نے درد کی دوا پائی۔ کچھ خلاء پانی سے پُر ہوا۔ اور پیٹ کے الاؤ کو دھیا کر کے ہم بستر میں گھس گئے۔

آنا فائر بریگیڈ کا مرزا نسیم بیگ کے گھر

ہمارے ہوٹل میں کوئی شخص انگریزی جانتا بولتا نہیں یہی حال ہماری فرانسیسی کا ہے کہ رفت گیا اور بولتا تھا اے آگے نہیں جاتی۔ پڑھنا تو اس زبان کا ایسا مشکل نہیں، لیکن بولنا؟ فرانسیسی میں سب سے مشکل مرحلہ یہی ہے۔ یہ ظالم لکھتے تو اے سے زیادہ ملک سبھی حروف ہیں لیکن بولنے میں ان میں سے دو تہائی کو پی جاتے ہیں۔ پیرس اُن کے ان پاری ہے اگرچہ بعضے بولنے میں اسے پنیہ بھی بنا دیتے ہیں۔ مشہور سر دے CHAMP ELYSEES کو آپ انگریزی میں شاید پڑھیں گے چیمپ الیسیز

بلکہ یہ ہے شانز ایلیزے۔ جس کے سر راہ کیفوں میں سنا ہے جمیل الدین عالی گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے اور دوہوں کے لیے مضمون لکھتے کرتے تھے۔ ہماری مرغوب سڑک انگریزی کے قاعدے سے بولوار ڈسینٹ ٹائیکل ہونی چاہیے۔ Boulevard

St. Michel - لیکن فرانسیسیوں کے نزدیک بولوار سال مثال ہے ہم میٹرو

یعنی زمین و ذریل میں سفر کرتے ہیں۔ ہمارا بتایا ہوا شیش لٹام کبھی کسی کی سمجھ میں نہ آیا نہ کسی کو بتایا ہوا ہماری سمجھ میں آیا۔ لکھ کے بتاتے ہیں تو مخاطب کہتا ہے - اچھا



یارب نہ وہ کچھ ہیں نہ سمجھیں گے مری بات

یہ مطلب ہے، تو میاں یوں کہو نا: "تھک مار کے ہم نے زبان کا ٹٹا ہی ختم کر دیا ہے
 ممکن نہیں کہ شیخ امرا القیس بنیں۔ پنڈت جی بالیک ہونے کے نہیں۔ رستر پوچھیں
 تو مہربان فرانسیسی آدھا گھنٹہ تک خون غاں کرتا ہے اور اپنی طرف سے وضاحت
 سے سمجھاتا ہے۔ لیکن جبارے کام کی چیز فقط اس کی انگلی کا اشارہ ہوتا ہے ہم نے
 بھی اب اشاروں کی زبان پر ایسا عبور حاصل کر لیا ہے کہ رازی کے نکتہ بائے وقت
 تک ان میں بیان کر سکتے ہیں لیکن کبھی کبھی اشارہ بھی رنجک چاٹ جاتا ہے۔ ہم کل
 نیچے میٹر کے پیٹ فارم پر پہنچ کر ایک صاحب دل فرانسیسی سے پوچھ بیٹھے کہ
 کیمرہ کاشیشن جہاں ہمیں جانا ہے (انگلی سے اشارہ کر کے) ادھر ہے یا ادھر ہے۔
 ایسا اکثر ہوا کہ ہمیں جانا مشرق کو ہے اور پہنچ گئے مغرب میں۔ اُس بھلے مانس نے

ہمارے بار بار کے استفسار کے جواب میں اپنی انگلی سے برابر نیچے ہی اشارہ کیا، کہ
ادھر نہ اُدھر بلکہ گاڑی یہیں آئے گی۔ ہم عاجز آکر وہاں سے ٹھکنے لگے تو ہمیں
پکڑ کر کھڑا ہو گیا، اور زبردستی اس گاڑی میں بٹھایا جو انہی طرف کو جاتی تھی۔

ہمارے دوست ہاشم نے کہ فرانس میں تازہ وارد بساط ہوئے دل میں یہ نسخہ
دریافت کیا کہ منہ پورا کھول کر آواز نکالو، تب صحیح فرانسیسی لہجہ برآمد ہوگا لیکن خود
ان کے ساتھ یہ گزر چکی ہے کہ ایک رستوران میں انھوں نے کسی چیز کا آرڈر دیا جو
تین فرانک کی تھی۔ پیرا اس نام سے ملتی جلتی دوسری چیز لے آیا جس کے انھیں کیس
فرانک دینے پڑے۔ ممکن ہے انھوں نے منہ پورے سے کم کھولا ہو یا زیادہ کھول
دیا ہو۔ بہر حال اب ان کا کہنا ہے کہ جب تک پور کا طرح فرانسیسی پر عبور نہ حاصل کر
لوں۔ کم از کم خریداری میں فرانسیسی استعمال نہ کروں گا۔ ان کی یہ احتیاطیں دشمنی
ہے۔ ایک دوست ہمارے انھیں کے سے تیراکی کا شوق رکھتے تھے۔ لیکن کہتے تھے کہ
جب تک اچھی طرح تیرنا نہ سیکھ جاؤں پانی میں نہیں اتروں گا۔ چنانچہ نہیں اترے۔

جب ہم رات کو گھر یعنی ہوٹل کے کمرے میں آتے ہیں تو کوئٹر پر جو صاحب ہیں
ہمیں ضرور کچھ نہ کچھ (فرانسیسی میں) بتاتی ہیں کہ یہ فون آیا تھا۔ یہ پیغام ہے ہم شکریہ
ادا کر کے اوپر آ جاتے ہیں۔ انھوں نے پیغام دے دیا۔ ہم نے سن لیا۔ الامال بالنیات
ہمارے دوست مرزا نسیم بیگ یونیورسٹی میں تیرہ برس سے ہیں اور فرانسیسی
فرقہ بستے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ تم پر کیا گزرے گی جو مجھ پر شروع کے ایام میں گزری۔
ہم نے کہا۔ ارشاد! تب انھوں نے بیان کیا کہ میں نے مکان یا تو گھر کے کام صفائی

دیگر کے لیے نوکرائی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہاں کے نوکر بھی نواب ہوتے ہیں۔ لیکن بہر حال کسی نے بتایا کہ لکھی کے کونے پر جو تبا کو فردش کی دکان ہے وہاں اپنا نام پتہ دے دو۔ ان کے پاس کوئی کام کی متقاضی آئے گی تو تمہارے پاس بھیج دیں گے۔ پس مرزا صاحب نے اپنی غوں غاں کر کے تبا کو فردش کو فرمائش نوٹ کرا دی اور اپنا پتہ دے دیا۔ آگے ان کی زبانی سنئے :

”تیسرے روز کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے کھولا تو دیکھا کہ ایک خاتون کھڑی ہیں۔ اچھی خاصی معزز۔ لیکن کام کے اوقات کے باہر تو ہر کوئی شان کا لباس پہنتا ہے۔ کنبھرے قصائی۔ تک سوٹ پہن کر صاحب بہادر بن جاتے ہیں۔ میں نے انھیں عزت آور سے پٹھایا۔ گفتگو شروع ہوئی، انگریزی میں :

Speak English? (انگریزی بولتے ہو؟) محترمہ نے پوچھا۔

Yes, speak English. (ہاں بولتا ہوں) میں نے کہا

Work? (کام؟)

Yes, work. (ہاں کام)

”کتنے گھنٹے؟“

”یہی چار پانچ گھنٹے“

”تخوہ؟“ ان محترمہ نے سوال کیا۔

”دمی جو عام طور پر ہوتی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”ہفتہ اتوار چھٹی؟“

”ہاں ہفتہ اتوار چھٹی“

”کب سے کام شروع کرنا ہے؟“

”جب سے آپ کا جی چاہے“

”آج ہی سے شروع ہو سکتا ہے؟“

”میں نے کہا۔ ان آج ہی سے شروع ہو سکتا ہے۔“

ان محترم نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور اس پر اپنا پتہ لکھ کر کہا ”یہ لو اس پتے پر آجانا۔“

تب جا کر بھید کھٹا کہ وہ محترم خود ایک نوکر کی تلاش میں تھیں۔ تب کہ فردش نے بتایا ہو گا کہ ایک صاحب آئے تھے کسی کام کی تلاش میں ہیں یہ رانا کا پتہ۔ وہ بیچاری نوکر کے لیے ترسی ہوئی خود میرے غریب خلعے پر پہنچ گئیں۔

دوسرا واقعہ جو مرزا نسیم بیگ کے ساتھ گزرا، نسبتاً زیادہ سنگین تھا۔ ان دنوں یہ ۹۵ وکٹر ہو گا یونیورسٹی پر رہتے تھے۔ ایک روز شام بیگم کے ساتھ باہر نکلے تو چابی اندر ہی بھول گئے۔ دروازہ اس قسم کا تھا جو بند تو خود بخود ہو جاتے ہیں لیکن کھلتے چابی سے ہیں۔ واپسی رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے ہوئی۔ حسیب میں اتھو ڈالا تو چابی نڈارد۔ کریں تو کیا کریں۔ نیچے ڈیوڑھی میں ایک بڑی بی رہتی تھیں۔ ان سے عرض حال کیا۔ وہ تھوڑی بہت انگریزی جانتی تھیں سمجھ گئیں اور ان کو مشورہ دیا کہ فائر بریگیڈ کے دفتر جاد ان کے پاس بسی میٹر حیاں ہوتی ہیں ان کی مدد سے کوئی شخص باورچی خلعے کے روشندان میں سے گھس کر اندر سے کنڈی کھول دے گا۔ آسان سی بات ہے۔“

فائر بریگیڈ کا دفتر پھوپھاڑے ہی میں تھا، انھوں نے وہاں جا کر مافی الضمیر
 بھانے کی کوشش کی۔ ایک دو نقطہ فریج کے کچھ انگریزی باقی اٹا سے وضاحت
 کے لیے چٹ پر گھر کا پتہ لکھا۔ ۹۵ داکٹر ہیوگو ایونو، داروغہ صاحب نے اسے
 دیکھتے ہی سیٹی دی اور ایک بٹن دبایا۔ چٹاٹک خود بخود کھل گیا اور دو فائر
 بریگیڈ کے انجن باہر نکل پڑے، فائر میں پہلی منزل پر چوکس بیٹھے تھے، ان کو حکم رہتا
 ہے کہ سیرھی یا لفٹ کا انتظار مت کرو، جو وہی حکم ملے پانی کے پائپ سے پھسل
 کر نیچے آ جاؤ، چنانچہ ایک کے بعد ایک نے نیچے اتارنا شروع کر دیا، مرزا صاحب
 کو صورت حال کا احساس ہوا بھاگے بھاگے ان کے پاس گئے، ان کو ہاتھ کے
 اٹا سے سے روکا لیکن جس کو روکتے وہ ان کا ہاتھ ایک طرف ہٹا دیتا تھا اور
 کہتا "۹۵ داکٹر ہیوگو ایونو" یعنی یہ کہ تمہارے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، ہمیں گھر
 کا پتہ معلوم ہے۔ دیکھتے دیکھتے وہ انجنوں پر سوار گھنٹیاں گھنٹے بھاگتے روانہ ہو گئے۔
 ان کے شور سے سارے محلے میں جاگ ہو گئی اور لوگ چونک کر کھڑکیوں میں سے بھاگنے
 لگے کہ کیا آفتاؤں پڑی۔ بعضوں نے فائر بریگیڈ دیکھ کر فرض کر لیا کہ آگ لگی ہے اور شور
 مچا، اور دھڑا دھڑا باہر پھلانگیں لگانا شروع کر دیا، ایک فائر میں نے ان کے فلیٹ
 کی کھڑکیوں پر پانی کا تڑیا بھی دینا شروع کیا اور دوسرا کھڑا لے کر اوپر چڑھ گیا لیکن
 آگ نہ دھواں کچھ ہوتا تو نظر آتا، جہوم میں ایک صاحب انگریز کا دان بھی تھے، ان
 کو مرزا صاحب نے بتایا کہ پانی اندر رہ گئی ہے فقط اس کو نکالنا ہے۔ جلد ان سے
 کہنے کہ اتنے کھڑاگ کی ضرورت نہیں۔ فقط ایک آدمی اندر گھس کر دروازہ کھول دے
 بڑی مہربانی ہوئی۔ وہ لوگ جکتے جکتے چلے گئے اور رپورٹ کی کہ ان صاحب کے ہاں



تھاکا جسے اگل گئی۔ ناحق غلط اطلاع دے کر ہمارے کام کا نقصان کیا ہے۔ ان سے ہرجانہ لیا جائے۔ بڑی مشکل سے معاملہ رفع و دفع ہوا۔

جماری گلی کے سرے پر ایک بہت پرانی بڈنگ تھی، مائٹارویں صدی کے اوائل کی کسی امیر کی حویلی رہی ہوگی۔ اس کے چھانک پر ایک بورڈ ہم نے دیکھا
 SORTIE DE VOITRES . ہم نے جی ہی جی میں فرانس والوں کی تعریف کی کہ اپنی تاریخی عمارتوں کا کتنا خیال کرتے ہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ نے بورڈ لگا دیا ہے کہ کوئی اسے گزندہ نہ پہنچائے۔ اس گلی میں آگے جا کر ایک اور عمارت کے چھانک پر بھی لکھا دیکھا۔ وہ بھی پرانی تھی لیکن اتنی زیادہ نہیں۔ گویا محکمہ آثار قدیمہ نے تہہ کر لیا ہے کہ پیرس کی عمارتوں کی پرانی شان برقرار رکھی جائے۔ لیکن بڑی سڑک پر ہم مڑے تو ایک بالکل نئی عمارت کے ملتے پر یہ بورڈ دیکھا۔ اب ہم حکیم میں پڑ گئے کہ اس سے آثار قدیمہ والوں کا کیا تعلق؟ آخر ایک صاحب سے پوچھا۔ وہ بہت ہنسے اور کہنے لگے یہ تو ہر دوسرے گھر کے چھانک پر لکھا ملے گا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہاں سے موٹر نکلے گی۔ کوئی صاحب اپنی گاڑی سٹننے کھڑی کر کے راستہ بند نہ کریں۔

ایک اور نوٹس ایک دیوار پر نظر آیا DEFENCE D'AFFICHER

آخری لفظ کا مطلب تو ہوا افریقہ اور ڈیفنس کا مطلب سب جانتے ہیں۔ ہمیں یاد آیا کہ الجزائر کی جنگ کے دنوں میں فرانسیسیوں کا بنی شکی طبقہ اس بات کے لیے مظاہر کر رہا تھا کہ افریقہ کی حفاظت کو یعنی حریت پسندوں کی شورش کو دباؤ۔ افریقہ پر

اپنا قبضہ برقرار رکھو یہ نعرہ جو بابا بجا ہر سر دک پر لکھا نظر آیا۔ تو ایک فریخ دان دست کے ساتھ ہم نے سامراجی فرسسیوں کی ذہنیت کا ماتم کیا۔ اس نے کہا تمہارا جذبہ قابل تعریف ہے لیکن اس فقرے کا مطلب ہے ”میاں اشتہار لگانا منع ہے“ شانزہویں پر ایک جگہ بہت سی چٹکی کا یہ لکھڑی نظر آئی۔ اوپر موٹے نفلوں میں لکھا تھا OCCASIONS - ہم حیران کہ اس نفل کے استعمال کا یہ کون سا موقع ہے۔ کئی دن کے بعد مجید لکھا کہ اس کا مطلب ہے سیکنڈ ہینڈ۔ وہ ساری موٹریں سیکنڈ ہینڈ تھیں اور برائے فروخت تھیں۔ دم تحریر ہماری زبان دانی کی زمیل میں ہوں شور (صحیح بخیر ملک دن بخیر) کے علاوہ جو الفاظ ہیں ان میں ایک SORTIE بھی ہے کیونکہ یہ ہر جگہ ہر عمارت میں زمین دوزیوں کے سٹیشنوں پر سینماؤں میں عجائب گھروں میں لکھا رہتا ہے۔ اس کا مطلب ہے EXIT یعنی باہر جانے کا راستہ۔ ہاشم نے کہا اسے مت بھولنا۔ بڑے کام کا لفظ ہے۔ کوئی افتاد آن پڑے تو کم از کم یہ تو جان لو گے کہ کدھر کو بھاگنا ہے اور واقعی ہم SORTIE کے نشانوں کے ساتھ ساتھ چلتے ایک جگہ دم لینے کو روکے بلکہ روکے گئے تب پتہ چلا کہ ہم فرانس کی حدود سے باہر آ گئے ہیں۔ ایک انگریز سا رجٹ ہمارا شانہ بٹا کر کہہ رہا تھا NO ENTRY - پہلے اپنا پاسپورٹ دکھاؤ، میاں جی۔



متفرقاتِ پیرس

پیرس میں جس روز ہم اترے، اسی روز جاڑے نے نزولِ اجلال کیا۔
 جانے کس نے موسم کو خبر کر دی تھی کہ ایک خریب الدیار ہلکا سوٹ پہن کر گھر سے
 نکلا ہے۔ خیمہ و خراہ بھی نہیں رکھتا۔ اس عروسِ البلاد میں بلانے والے اسے
 چالیس فرانک (۱۰ روپے) روزانہ دیں گے اور بھوکا ماریں گے کیونکہ اتنا تو اس کے
 ہونٹ کا کرایہ ہی ہے سے نہ پتلیہ نہ پٹنے کی استطاعت رکھتا ہے۔ پہلوئی دل
 گرم ضرور ہے بلکہ یوں کیسے کہ کبھی تھا کیونکہ وہ بھی لوگوں کی سرد مہربوں کے
 تھپڑے کھا کھا کر شیر گرم رہ گیا ہے۔ بقول انگلستان کے آغا شہزادیم شکسپیر کے:
 چل اے ہوائے زمناں چل اور زور سے چل
 تو سرد مہریٰ اجاب سے زیادہ نہیں

کہہ نہیں سکتے کہ پیرس کی کس بات پر ہمارا دل آیا۔ خوباں تو یہاں کے جیسے
 بھی ہوں۔ لیکن ہمیں سین کے ساحلوں کی آوارہ گردی۔ پرانی کتابوں، نقشوں



انہ ہی جاتی ہے اور سر کو بھی نظر کیسا سمجھئے

اور تصویروں کی سیروریا، دکانوں کے ذخیرے اور شاہراہ ساں مشال ST. MICHAEL - کا ماحول خاص طور پر جھلے۔ درگاہوں کا ماحول ہم آپ جانتے ہیں کہ کیسا ہوتا ہے۔ جو استاد سخت گیر وارڈن — آپ منچے ہیں تو اونچی دیواریں چاندیتے۔ گندی پھیلتے ورنہ لیکن سوہنوں کے طالب علموں کو فرانس کی روایات آزادی سے صحتہ وافر ملتا ہے۔ ان طالب علموں

میں گورے بھی ہیں۔ کالے بھی۔ دیوار رنگ جو برطانیہ میں کم کم اور امریکہ میں
 بہت اونچی ہے۔ فرانس میں وجود نہیں رکھتی۔ کالوں کو دیکھا کہ شکس تو ہم ایسی
 لیکن نصیب سکندری۔ ہرزخ کی چورچ میں ایک ایک دو دو انگر۔ جوانی کی
 راتیں مراؤں کے دن۔ اے میاں کیوں اتنی دیر کر کے آتے۔ اب ہمیں فونڈ
 چراغ رخ زیبائے کر۔ یہاں کے لوگ بھی طالب علموں کو سرانگھوں پر بجاتے
 ہیں۔ اگر کسی ڈرائیو یا ٹرانسپورٹ دس یا بیس فرانک ہے تو طالب علم کا ایک فرانک
 بھی بہت جانا جاتا ہے۔ یہ بھارے بھی قندرانہ زندگی کے عادی ہیں کہ چھ سال مثال
 کے دو روپے سستے کیفوں کی قطاریں ہیں۔ طالب علموں کے غول باہر لگے ہوئے مینو
 پڑھ کر کم خرچ کھانوں کا انتخاب کرتے ہیں، بلکہ زیادہ تر تو چھچھے اور پلیٹ کے گھنجبت
 میں نہیں پڑتے۔ اتھیں سینڈوچ ہے۔ جب ذرا گرون جھکائی کھایا۔ اس
 آزادی اور شان قندری کی توقع لندن، آکسفورڈ یا کیمبرج کے طالب علم سے رکھتے۔

حسن کی شوخیاں اور عشق کی گرمیاں یورپ کے لئے نئی بات نہیں۔ اب تو
 پروے پر پردا اٹھ رہا ہے۔ لیکن آناجم کہیں گے کہ پیرس میں لندن کا سا ابتذال
 نہیں۔ لندن میں تو سیدھی سادھی حجم فروشی ہوتی ہے۔ پیرس میں لب و لہار کی دعوتیں
 ضرور ہوتی ہیں :-

چھاتی سے لگا پوم یا، ہو گئے چمکے
 لیکن غنڈہ گردی اور بیسواپن نہیں، عاشقی بھی سیتے کی اور فاسقی بھی سیتے کی۔

اُدھر ہمارے پیرس سے جانے کے دن قریب آتے جا رہے تھے یعنی گاڑں
 کنارے باجا باجے لندن میں بسانا ہوگا۔ اُدھر پیرس سے محبت بڑھتی جا رہی ہے
 چل خود بخود دل میں ہے یہ شہر سما یا جاتا

شہر تو ہم نے اور بھی دیکھے ہیں لیکن جو بات پیرس کی ہے وہ اور کہاں
 ہے ہوا میں شراب کی تاثیر

زبان نہیں آتی۔ بھلے سے نہ آئے۔ آخر گزارہ چل ہی رہا ہے۔ چھ سال پہلے
 ہم نے پیرس قطعی مسافرانہ یعنی سیاحانہ دیکھا تھا۔ ایک ٹورسٹ بس میں بیٹھ گئے
 تھے اور اس نے شہر میں گھمادیا تھا کہ یہ نوپور کا مقبرہ ہے۔ یہ عراب فتح ہے۔ یہ
 فوری ڈیم کا گر جا ہے۔ اور وہ ٹور کے در دیوار ہیں۔ دود سے دیکھ لو۔ پھر نہ
 کنا جیسے خبر نہ ہوئی۔ یہ تو کچھ دیکھنا نہ ہوا۔ اس بار ہم نے اپنے شوق کو دہر بنایا
 اور اپنی ٹانگوں کی سواری پسندی۔ فوری ڈیم یا فوری داسے کو بھی بھر کے
 فرصت سے دیکھا۔ مذہبی سر دس میں بھی پھیلی پیچوں پر بیٹھے اور اس کی عظمت و
 جہروت کا نقش دل پر لے کر آئے۔ پیرس میں یہ سب سے محترم عبادت گاہ ہے
 لیکن ہم تو اسے دکنر ہو گئے اور اس کے نادل فوری ڈیم کا کبرٹاکے حوالے سے جانتے
 ہیں۔ یہاں ایک زمانے میں جیو میٹر کا مندر ہوا کرتا تھا اس کی جگہ بار جویں اور چودھویں
 صدی عیسوی کے درمیان یہ گر جاتعمیر ہوا۔ ذرا اس کی رفعت کو دیکھئے۔ اور وسعت
 کو دیکھئے۔ اس کی پشانی کے مجسموں کو دیکھئے۔ اس کی زلیخیں نقش کھرکیوں کو دیکھئے
 بلند و بالا ستونوں اور محزوظی چھت کی زیبائش پر نظر کیجئے۔ جاتے کتے برس اس



ٹورسٹ کا مطلب ہے امریکن ٹورسٹ

کام میں لگے ہوں گے ۔

فرانسیسی لوگ اپنی زبان پر ایسا فخر کرتے ہیں کہ شاذ و نادر ہی کہیں انگریزی کا کوئی ٹوئٹ ملتا ہے۔ لیکن نوٹرے ڈیم کے دروازے کے پاس جو ٹوئٹ ہے، وہ انگریزی میں ہے ۔

” یہ میوزیم نہیں ہے۔ خانہ خدا ہے۔ یہاں ڈھنگ کا لباس پہن کر آؤ۔ اسے کیسل کا میدان یا ساحل بحر مت تصور کرو کہ کچھ پینا پینا نہ پینا نہ پینا۔“

بھے سے پتہ چل جاتا ہے کہ خطاب دنیا کی سب سے امیر لیکن نو دوستی قوم امریکہ سے ہے۔ یا پھر ایک تحریر ایونیو بوسکے کی ایک دیوار پر انگریزی میں نظر آئی :-

U.S. GO HOME

لندن

۱۳۰۱ ستمبر تا ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۴ء



لندن سے ایک خط

عالی میاں !

یہ لندن ہے اور لندن میں مسز دانش کا بھتیجا خانہ موسوم بہ گلوٹر ہوئی۔ اس وقت میں مکرو نمبر ۷ سے جو تہ خانے میں شکر کے رخ واقع ہے اور جس کی کھر کی کے باہر کوڑے کا دم نظر آ رہا ہے، یہ نامہ شوق آپ کی خدمت میں لکھ رہا ہوں۔ میرا قریبی واساں گونے کسی غریب مسافر کے سرائے میں جانے اور بھتیجاؤں سے پالا پڑنے کا حال اپنی داستانِ بولی میں لکھا ہے، اس وقت یاد آگیا۔ لیکن نہیں۔ یہاں اتنی زدہ کیفیت بھی نہیں۔ ہاتھی ملے گا بھی تو کہاں تک۔ یہ سچ ہے کہ وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں۔ یعنی یہ مکرو وہ نہیں جس کی بٹک میں نے کراچی ہی سے خط لکھ کے کرائی تھی۔ بے مہر مسز دانش نے وہ کسی اور گاہک کو دے دیا۔ اور دیکھا مجھے تو چھوڑ دینے سکر کے ہاتھ۔ یعنی میرا منہ ٹکٹے لگیں کہ آپ تو ہر سچ آگئے۔ میں نے کہا، ہم باہر خاطر ہوں تو کہیں اور ٹھکانا کریں، شبِ باشی کا سنا کریں۔ سوچ کر بولیں، ابھی نہیں شہرے کوئی بندوبست کرتی ہوں۔ میری خاطر ان کو اتنی منظور ہوئی کہ اس کمرے سے نوکرانی میری کولالت مار کر نکال دیا۔ میں نے کہا۔ یہ کیا کیا؟ اس

بھاری کو کیوں نکالا مجھے کیس اور جگہ مل جائے گی۔ بولی: اچھی صاحب آپ پروا نہ کیجئے۔
 رقیق القلب نہ بنیئے۔ آپ میرے لئے زیادہ اہم ہیں۔ بزنس اور بزنس اس کا کیا ہے چند
 دن میں دھکے کھا کر پھر آجائے گی۔ کئی بار جا چکی ہے اور آچکی ہے۔ وہ تو لایٹے ایک ہفتہ
 کا کرایہ پیشگی۔ آٹھ پونڈ۔ آپ نے لندن میں ایشیا توں سے نسلی آتیا زہرتے جانے کی داستانیں
 سنی ہوں گی اور خبریں دیکھی ہوں گی۔ لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ مسر وائٹس نے میری خاطر اپنی ایک مہوطن
 کو جتالیا۔..... وہ آٹھ پونڈ کی بات البتہ ہے۔ رنگ و نسل اپنی جگہ پیسا اپنی جگہ۔

لندن بالکل ویسا ہی ہے جیسا میں چھ سال پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ اتفاقات سنو کہ ۱۹۶۱ء میں
 بھی ۵ دسمبر کو جل کر ۱۲ دسمبر کو وارڈ لندن ہوا تھا۔ اب کے بھی ۵ دسمبر کو چلا اور ایک ہفتہ راستے میں
 گزرا کہ ۱۲ دسمبر کو بیاں پہنچا۔ اُس سال بھی ان تاریخوں کو منگل کا دن پڑا تھا اب کے بھی منگل ہی کا
 ساتھ ہے۔ پیر میں ۱۵ دسمبر میں میرے کمرے کا قبرعہ اتھا۔ یہاں بھی ۱۷ ہے۔ یہاں میں شام
 کے صبح پنے میں پہنچا لیکن ہر چیز کچھ مانوس مانوس معلوم ہوئی۔ صبح دم دیکھتا ہوں کہ یہ تو کوئیز
 گارڈن کے بالکل ساتھ والی گلی ہے۔ کوئیز گارڈن وہ جگہ ہے جہاں میں اُس سال ٹھہرا تھا۔ فقط
 ٹھہرا ہی نہیں تھا۔ حضرت نوحؑ نادی کے مصرع کی پوری واردات ہوئی تھی۔

کو اُس نے بلایا، بلا کر بٹھایا، بٹھا کر اٹھایا، اٹھا کر نکالا

آپ کو یاد ہو گا اس سال میرے ساتھ اپنے بنگال شاعر ابو العین بھی تھے۔ ہم دونوں ٹیم کا میلہ
 جھٹکا کر بیاں آتے اور سید الطہری کی مہمانی سے کوئیز گارڈن کے نمبر ۵ میں ۳ نمبر کا کمرہ مل گیا تھا
 جہاں پروگرام لندن میں فقط آٹھ دس روزہ کئے کا تھا لیکن ہوتے ہوتے پانچ ہفتے گزر گئے تھے کہ

یاد آشتا پوچھنے لگے کہ میاں ابھی گئے نہیں؟ کب جاؤ گے؟ بی بی سی کے دوستوں نے ہم سے تقریریں لکھوانا اور انہیں پڑھوانا بھی بند کر دیا۔ لندن میں دیکھنے کے مقامات بھی ختم ہو گئے۔ ہمارا غیر ملکی زہر مبادلہ کا توازن بھی ختم ہو گیا تھا اور ہمارے ہلکے مکان نے بھی مصنوعی اندام پر تباہی موقوف کر دیا تھا۔ اس کے باوجود ہم لندن میں تھے۔ محض ابو الحسین صاحب کی پراسرار بیماری کی وجہ سے ابو الحسین نے لندن چھوڑنے ہی ڈاکٹروں اور ہسپتالوں کے ہتھ پوچھنے شروع کر دیئے تھے۔ ایک روز ہم نے گفتگو میں ڈاکٹر گراہم ہیلی کا ذکر کیا تو بوسے کس چیز کا ڈاکٹر ہے۔ بھگے اس کے پاس بے چلونا، ہم نے کہا اول تو وہ مسابیات کا ڈاکٹر ہے اور تمہاری بیماری اس سے مختلف معلوم ہوئی ہے۔ دوسرے بقیہ حیات نہیں ہے۔ اس پر انہوں نے دوسرے دوستوں سے رجوع کرنا شروع کیا۔ خصوصاً لندن میں رہنے والے بنگالیوں سے جیسے ڈن کے مرض کی نوعیت معلوم تھی نہ ہم نے اس کے متعلق استفسار کرنا مناسب جانا تھا کہ جانے کونسی اور کیسی بیماری ہو جس کے ذکر سے وہ آپ بھی شرمسار ہوں اور میں بھی شرمسار کریں۔ لیکن جب آٹھ روز گزر گئے اور ہم نے لندن سے آگے چلنے کو کہا تو ابو الحسین بوسے: میاں تم چاہو تو جاؤ میں چند دن اور لندن میں رہوں گا۔ علاج کر کے جاؤں گا۔ آخر ہم نے معافی پا کر پوچھ ہی لیا کہ مرض ہے کیا؟

بوسے: یہ پرانا مرض ہے۔ پاکستان میں اس کا بہت علاج کراچیکا ہوں لیکن نہیں جاتا۔ پاکستان کے ڈاکٹر، عظیم، دیدار، امروہی، سٹیجے، ہرمیو، سٹیجے، فٹ پاتھینے سب دیکھ لئے ہیں تو لندن آیا اسی کارن ہوں شاعری لکھتا تو بنانا تھا۔

ہم نے کہا: کچھ مرض کی تفصیل تو بیان ہو۔

بوسے: جس روز دفتر میں مجھے آٹھ دس گھنٹے مسلسل کرسی پر بیٹھا پڑے تو ٹیڑھیں



درد ہونے لگتا ہے :

"مغول یا شدید ؟"

"نہیں شدید تو نہیں ہوتا۔ میٹھا میٹھا ہلکا ہلکا"

"اور وہ مستقل رہتا ہے ؟"

"نہیں۔ پانچ سات منٹ میں جاتا رہتا ہے"

"ہر روز ہر جاتا ہے ؟"

"نہیں بلکہ جس روز آٹھ دس گھنٹے مسلسل بیٹھا پڑے"

ہم نے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔ بہت سنگین مرض معلوم ہوتا ہے۔ ہم کے

علاج کراؤ۔ ہاس کرائی ہے ؟

"کرائی"

"جوشاندہ پیا ؟"

"ہاں"

"ٹیکے لگوائے ؟"

"لگوائے"

"علاقت کی دوائیں کھائیں ؟"

"کھائیں"

"گڈے تعویذ کئے ؟"

"کئے"

"آپریشن کرایا ؟"

”کس چیز کا؟“

دماغ کا، اور کس کا؟ جیسے مانس کیوں ڈاکٹروں کو پریشان کرتے ہو۔ نعمان کے پاس گئے
ہوتے لیکن تمہارے مرض کی دوا شاید اس کے پاس بھی نہ ہو۔ یہ مرض لاعلاج ہے۔ اب اپنی
زندگی کے باقی دن جوں توں پورے کرو۔

ابوالحسن صاحب نے تو نہایت وسیع اقلیتی سے اجازت دیدی کہ تم چاہو تو جاؤ لیکن
یورپ کے کئی ملکوں کا پروگرام باقی تھا اور تنہا آدمی سفر میں نہ چھو جاتا ہے۔ دو ہوں تو آپس
میں دیکھ سکتے ہیں۔ ایک کمرہ لے لینا سستا پڑتا ہے۔ سواری بھی جیسے ایک نے لی دو
نے لے لی، کئی بار ایک کو سامان کے پاس چھوڑ کر دوسرے کو کوئی اور امر دیکھنا ہوتا ہے بہر حال
پردیس میں ممانہی بہت غنیمت ہے خواہ وہ ابوالحسن کا سا ہی کیوں نہ ہو
آخر میں سوچا کہ جن لوگوں سے رخصت ہواتے ہیں کہ بیکار جا رہے ہوں۔ ان کے سامنے
نہ جائیں گے اور لندن کے گلی کوچوں کا گشت جاری رکھیں گے۔

خیر تو اب قصہ غلو سے آدم کے نکلنے کا سینے؛

وہ رات بڑی سمانی رات تھی۔ ابوالحسن اس روز اپنے ایک دوست کے ان دعوت تھے اور
انہیں سونا بھی دیں تھا۔ ہم نے فرے فرے سے ڈھائی شنگ والاسینا دیکھا اور ذہین دوز
ریل پر ڈاکٹر کو سڑوسے سٹیشن پر نکل آئے بھوک لگ رہی تھی۔ کسی اور کھانے کا اس وقت سوال
نہ تھا۔ کوئٹہ سے کے ایک کونے سے دہلی سے لی۔ گراپی میں ریو سینا کے آگے اور دیگر مقامات
پر بھی آپ دیکھیں گے کہ جینس کے موٹے قیے کے شامی کباب تلنے والے بیٹھے رہتے ہیں آپ

پہنچے انھوں نے ایک چھوٹی ڈبل روٹی یعنی بن کا پیٹ چاک کیا، اس میں ایک کباب مع تھوڑے پایاؤں پختی کے رکھا اور آپ کو تھمایا، یہاں خدا جلے اس کا کیا نام ہے۔ لہذا میں جو تو دہی نام پاتے۔ اور دو ڈھائی روپے میں بکے، خیر دہی نے سامنے کی خود کارشین میں چھ پنس ڈال دو وہ کا ٹھنڈا گھاس بڑا کیا اور ایک اتھر میں یہ ایک میں مے کچھ لٹکتا ہے، سیٹی بجاتے گھر کا رخ کیا۔

پاس بان دروازے کے باہر ہی کھڑا تھا اس نے کچھ کھنے کی کوشش کی۔ ہم نے تصور سے چھانکا کہ سلام کر رہا ہے، خیریت پوچھ رہا ہے۔ لہذا نہایت خوش دلی سے اس کی بھی خیریت پوچھی اور موسم کی خوشگوار سی بھی مطلع کیا، لیکن اندر بیڑیاں چڑھنے سے پہلے ایک دم کو ٹھٹھکے، وہاں ایک اور درکوت زمین پر پڑا تھا، بائیں ہمارے اور درکوت کا ہم شکل۔ غور سے دیکھا تو ایک سوٹ کیس نظر آیا۔ یہ بھی اتفاق سے عین ہمارے سوٹ کیس کے ناک نقشے کا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک تھیلہ ابوالسین کے تھیلے کے مشابہ نظر آیا اور کتابوں کا ایک ڈیمر اتفاق کیسے کہ ان کتابوں میں سے بھی بھی ہمارے پاس اور پر کمرے میں موجود تھیں، قیضیں ٹائیاں وغیرہ بھی ایک دوسرے پر ڈھیر لیکن ہمارے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ ادھر توجہ دیتے اور یوں بھی ان چیزوں سے ہمارا کیا تعلق تھا، خیر ہم اور پر کمرہ نمبر ۲ یعنی اپنے غریب غلے پر پہنچے۔ اور دروازے میں کبھی گھمائی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک صاحب کھڑے ہیں بیلنگ سوٹ پہنے درشتی سے بولے،

”کیا چاہتے ہو؟“

”ہم نے کہا: یہ ہمارا کمرہ ہے، آپ یہاں کہاں؟“

”انھوں نے کہا: یہ آج سے ہمارا ہے، ہم نے کرایہ دیا ہے، پوچھ لو پاس بان سے۔“

اتنے میں پاسبان بھی آنی موجود ہوا تھا۔ اس نے بھی بیٹھے پر اتھار رکھ کر جگ کر تعذیبی کی اور کہا: سچی ان آپ کی میعاد ختم ہوئی، اب یہ ابن کا ہے۔
 "لیکن تمہیں کیا سچی ہے ہمارا کمرہ کسی کو دینے کا۔"

اس نے کہا: جناب حسبِ قاعدہ آپ کو میعاد ختم ہونے سے دو دن پہلے مطلع کرنا چاہئے تھا کہ آپ اگلے ہفتے بھی اس میں فروکش رہیں گے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ آپ کھڑے کھڑے غالی کر دیں اور ہمیں کرایہ دار کے انتظار میں جھینٹا پڑے۔

ہم نے کہا: تم ہم سے پورے ہفتے کا یعنی پیر تا اتوار کا کرایہ وصول کر سکتے تھے لیکن یوں ہمیں کمرے سے بے دخل کرنے کا اختیار نہ تھا۔

پاسبان یا نگران جو بھی کچھ اُسے کیئے مانگا لا رہے والا تھا۔ اور مانگا کے رہنے والے پاکستانیوں، ہندوستانیوں سے یوں بھی خار کھاتے ہیں۔

اس نے کہا: جناب پھر آپ ایسے لوگ ہی جھگڑا کرتے ہیں کہ پورے ہفتے کا کرایہ نہیں دیں گے۔ آپ کو کمرہ مطلوب تھا تو دو روز پہلے نہ کہہ سکتے تھے:

یہ بات سچ تھی مگر ہمارا قصور زیادہ نہ تھا۔ ابوالحسین اپنی بیماری کے کارن لندن سے اپنی روانگی ہر روز ملتوی کرتے تھے اور ہم روز کو پن ہیگن کی سیٹ کینسل کرتے تھے۔ اب کے خیال تھا کہ مجھے یا ہفتے۔۔۔ حد سے حد اتوار کو ہم کمرہ اور لندن چھوڑ روانہ ہو جائیں گے لیکن وہ نہ ہوا۔ یہ ہمارے گمان میں بھی نہ تھا کہ مالک کسی اور کرایہ دار کھئے آئے گا۔

ہم نے کہا: اچھا جس کوئی اور کمرہ دے دو:

انہوں نے کہا: بالکل نہیں ہے کمرہ ہمارے ان۔

ہم نے بہت کہا کہ ہم تمہارے پرانے اور مستقل مالک ہیں۔ چار ہفتے سے یہاں مقیم ہیں۔

ہم سے یہ بے رخی نہ برتو۔۔۔ لیکن وہ خدا کا بندہ نہ پسچا۔ بولا: کہیں اور ڈھونڈ دیتے۔ یہاں اب آپ کو کمرہ ملنے سے رہا۔

ہم نے کہا: میاں جہارا سامان تو کمرے ہی میں ہے۔ اسے تو نکال لیں۔

بولا: جناب کمرے میں نہیں اپنے سیڑھیوں کے پاس فرش پر ہم نے ڈھیر کر دیا ہے اسے فوراً اٹھو لیتے۔ ورنہ ہم کسی چیز کی کمی بیشی کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔

یہ وقت کوئی گیارہ ساڑھے گیارہ بجے رات کا تھا۔ اور اس خفشار کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم تنہا تھے۔ ممکن ہے! تھا پانی تک نوبت پہنچتی۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ اتھہ ہمارے خالی نہیں۔ ایک میں دہی تھی ایک میں دودھ کی بوتلی۔ یہ چیزیں کمرے میں بیٹھ کر گندھی لگا کر کھانے کی تھیں لیکن اس بے سرو سامانی میں ان کا کیا کریں! کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ہاں اس سے کہا کہ بیٹا ایک دو گھنٹے ہمارے سامان پر نظر رکھو! ہم کوئی اور کمرہ تلاش کریں تو اٹھائیں۔ وہ کچھ نہ بولا۔ کم از کم معترض نہ ہوا۔

گلی میں غل کر ہم کو سب سے پہلے اتھہ خال کرنے کی نظر ہوئی فٹ پاتھ پر بیٹھ کر تو کچھ نہ لکھیا جاسکتا تھا۔ چلتے چلتے جی کسنا ممکن نہ تھا۔ ممکن ہوتا تو خواب تہذیب ہوتا۔ دو گلیاں چھوڑ کر گلی میں کچھ کاریں پارک تھیں۔ ہم نے ان کی اوٹ میں جا کر جھڑی جھڑی کے چٹے کانٹے اور پھر غٹ فٹ دودھ پل گئے۔

پہلی بات ہی سمجھ میں آئی کہ میدان طہر علی سے استمداد کریں۔ کم از کم یہ رات اس کے کمرے کے فرش پر کاٹیں۔ کل مکان تلاش کریں گے۔ اس کا گھر تھا۔ جی دور تھا۔ گھنٹی بجائی۔ صدائے برخواست۔ گویا موصوف ابھی باہر سے تشریف نہ لائے تھے۔ خود گھنڈہ اور دھڑ گھوم کر پھر گھنٹی

جا بھائی۔ پھر کوئی جواب نہ آیا۔ اب کے ہم نے دوسری گھنٹی بجا کر لیڈ فیڈ کی خاموشی کو بتایا۔ وہ
بلتی جھلکتی برآمدہ میں اندر لگا، کیا بات ہے جی؟

ہم نے کہا: آتھر کو پوچھتے ہیں۔

بولیں: پھر ان کی گھنٹی بجائو۔ مجھے کیوں تنگ کرتے ہو؟

ہم نے کہا: وہ تو ہے نہیں۔ اجازت ہو تو یہاں ٹریڈر سی میں بیٹے کے انتظار کر لیں۔

باہر سرودی بھی ہے۔

بولیں: بالکل نہیں۔ آپ باہر جلیتے۔ میں پاکستانیوں کو خوب اچھی طرح جانتی ہوں بہت

بے ڈھب اور بد معاملہ لوگ ہوتے ہیں۔ آتھر آجاتے تو اس کے ساتھ آندرا آسکتے ہو۔ لیکن اس
کے کمرے میں سونے کی کوشش پھر بھی نہ کرنا۔

ہم نے اجازت سے کہا: آج کی رات ہم بے خانان ہیں۔ اچھا یہ اجازت دو کہ یہ رات

اس کے کمرے میں ڈال آئیں۔ اس کی انھوں نے اذراہ غایت اجازت سے دی۔ اور ہم نے

احوال اپنی بے دخلی کا رقم کر کے رات آتھر کے کمرے میں چھینک دیا۔

باہر نکل کر ہم نے دیکھا کہ سامنے ہی ہوٹل ہے۔ نام اب اس کا یاد نہیں۔ گھنٹی بجائی تو ایک

جلی گئی چین بھیں بڑھا برآمدہ ہوئی بولیں: ... یہ کیا وقت ہے شریف آدمیوں کو تنگ کرنے کا؟

ہم نے عمر بھر کی عاجزی اپنے لہجے میں سو کر کہا کہ ہم اس وقت بے ٹھکانہ ہیں۔ آدمی شب

کا عالم ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سوئیں۔ پھر آخر آپ کی دولت مشترکہ کے آدمی ہیں۔

بولیں: میں نے کوئی ٹیکہ نہ رکھا ہے۔ جاؤ جھلے آدمیوں کو بے وقت پریشان نہیں

کرتے۔ نہیں ہے جگہ میرے ہاں؟

ایک اور ہوٹل میں پوچھا۔ وہاں بھی یہی جواب ملا۔

ایک فن سے قری ہوئے سے بات کی۔ مینجر نے کہا، ہمارے ہاں جگہ ہے۔ تشریف لے آئیے۔ جب ہم خوش خوش وہاں پہنچے تو مینجر ہماری جلد کی رنگت دیکھ کر بہت گھبراہٹ ہو گیا۔ بختاب جگہ تو باطل نہیں۔

ہم نے کہا..... دس منٹ پہلے تم نے کہا تھا کہ ہے۔
 بولا..... جی ہاں! لیکن اس عرصے میں دوڑ گئی۔ معافی چاہتا ہوں۔
 یہ کہہ کر بڑے زور سے دروازہ بند کیا۔

اب کوئی عالم ایک بچے کا ہو گا۔ ہم نے سوچا اب دیکھیں اظہر آیا ہے کہ نہیں گھنٹی بجائی۔
 اظہر صاحب برآمد ہوئے۔ ہم نے کہا، تم نے میرا رقعہ نہیں دیکھا تھا؟ مدد کو کیوں نہیں آئے؟
 بولے، اب تمہارے گھنٹی بجانے پر دیکھا ہے وہ نہ ہی خیال کیا کہ یونہی کوئی کاغذ ہو گا۔
 اب میری فیڈ لیڈی تو بہت سخت ہے تمہیں میرے کمرے میں گھسنے نہیں دے گی کہیں اور
 تلاش کریں۔

اب ہم دونوں نے ایک دوجے کو کشش کی، لیکن ناہام۔ آخر انہوں نے کہا۔ یہ سامنے
 وائے مکان کے پارہاں سے ایک سیلک ہے اور چونکہ میں یہاں کئی مہینوں سے رہتا ہوں شاید
 کام بن جائے۔

ہم نے کہا۔ ہم دیکھ چکے۔ ان کے ہاں بھی مطلق جگہ نہیں۔
 اس کے باوجود ہم نے وہاں جا کے دستک دی۔ پارہاں صاحب بکھے۔ بولے جگہ باطل
 نہیں۔ میں ان صاحب کو پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ اب اظہر نے ان کی خوشامدی اپنی ہمایاں کی اور
 ہماری بدعالی کا ذکر کیا اور کہا۔ فقط آج رات کی بات ہے کل یہ انتقام کر لیں گے۔

اس مرد شریف نے کہا: بچے تو خانے میں خادمہ کا کمرہ ہے اس میں یہ رات کاٹ لیں۔
 کرایہ سوا پونڈ ہوگا۔ لیکن صبح کرو خالی کمرے سامان و خیریں جمع کرا دیں اور گیارہ بار قہقہے
 تک اٹھولے جائیں۔

ہم نے اور اظہر نے ان کی انسان دوستی اور نیکی کا صدق دل سے شکریہ ادا کیا اور
 دو نوٹے مل کر سامان ڈھرایا۔ تین پھیرے ہوئے۔ آخر سے معذرت کی کہ جہائی تمہیں بے حد
 تکلیف دی۔ خدا کا شکر کیا کہ چھت تو نصیب ہوئی۔

ارے بھئی یہ خط تو نہ ہمد بن سدا ان کی داستان بن گیا۔ ہم نکلیں اور پڑھا کرے کوئی۔
 سالانہ مذکور صرف اس کمرے کا تھا۔ کچھ ایسا برا نہیں غسل خانے کمرے میں نہیں لیکن کچھ دور بھی
 نہیں۔ چوہا کمرے کے کونے ہی میں ہے۔ واش بین بھی جس میں سے اس وقت بھی ٹپ ٹپ
 کی سڑی صدا آرہی ہے۔ پانی قطرو قطرو گرا رہا ہے کیونکہ نئی پوری طرح بند نہیں ہوتا۔ کونٹرز
 گارڈن کے جس مکان کا قصہ میں نے چھیلا یا ہے وہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ تو اس کے تعلق سے
 ایک اور قصہ سنو۔ قبرستان کونٹرز گارڈن میں کل چھ سات کمرے ہوں گے۔ ہمارا کمرہ پہلی منزل پر
 تھا۔ غسل خانہ بچے گراؤنڈ غور پر۔ اس غسل خانے کے ساتھ ایک کمرہ آؤس کیر کا اور ایک میں
 ایک طرحہ اور اور طرز صاحبہ۔ وہ کیا کرتی تھیں۔ کیا کمائی کھاتی تھیں؟ یہ معلوم نہیں۔ ان ایک بار زور
 زور سے ہانکے مکان کے گماشتہ کے ساتھ لڑائی دیکھی گئی تھیں کہ تم لوگ مجھے بدنام کرتے ہو، جانے
 کیا بھتے ہو؟ خیر۔ ایک روز بوقت نیم شب اپنے کمرے سے بچے غسل خانے میں جانے کے
 لئے زینہ زینہ اتر رہے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کوئی نیم تاریک کاریڈور میں مدد دور واز سے
 ساکھڑا ہے۔ آواز دی کون ہے؟ یہ وہی صاحبہ تھیں۔

زینے کے قریب آئیں تو دیکھا کہ پٹے ہوتے ہیں۔ لہذا لٹکھڑا رہی ہیں اور نہیں سگریٹ
 ہے۔ بولیں: آپ کے پاس ماچس ہے؟
 ہم نے کہا: ”سوری! نہیں ہے۔“
 وہ پھر بولیں: ”جناب میں ماچس مانگ رہی ہوں۔“
 ہم نے ذرا فصاحت سے کہا:
 ”نہیں ہے ماچس ہمارے پاس، کیونکہ ہم سگریٹ نہیں پیتے۔“ یہ کہہ کر غصہ خانہ میں
 چلے گئے۔

غصہ خانے میں آدھ گھنٹہ تو لگا ہو گا۔ باہر نکل کر دیکھا کہ وہ وہیں کھڑی ہیں۔ بولیں:
 ”پلیز — مجھے ماچس ضرور چاہیئے۔“

ہمیں احساس ہوا کہ یہ پاری لکھنی ضرورت مند ہے۔ اس کے ساتھ ہی یاد آیا کہ بس سڑک سے
 ایک ماچس بطور سونیٹر خریدی تھی۔ ہم نے کہا آپ یہیں ٹھہریے، میں اپنے سامان میں تلاش
 کرتا ہوں۔

بولیں، میں آؤں تلاش میں مدد دوں۔

ہم نے کہا: ”نہیں آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں، یہیں ٹھہریے۔“

اوپر ابوالحسن تو سوتے ہوئے تھے۔ ہم نے سوٹ کیس کے ایک کونے میں ماچس دریافت
 کر لی لی۔ اور نیچے آکر اُن صاحب کو تھا کے لئے پاؤں میسر میاں چڑھنے لگے۔ ہمیں تعجب تھا
 کہ انھوں نے شکریہ تک ادا نہ کیا۔ بجو خٹکی کھڑی رہیں۔ خیر ایسا ہوتا ہی ہے ہم اوپر لگے سوئے۔

دوسرے روز بی بی سہمی میں اپنے دوستوں سے یہ واقعہ بیان کیا تو ان کو عیقلہ مل گیا۔

پہلے تو خود ہنسنے۔ پھر جو بھی ملتا اس کو سنواتے کہ سنورات انشا صاحب کے ساتھ کیا ہوا۔ ان سے کلاماتِ ماجس مانگی گئی تھی۔ آخر ہم نے پاکستان سیکشن کی سیکرٹری مس مارجرئی کی طرف انصاف طلب نگاہوں سے دیکھا۔ تھی مٹی سی رز کی تھی۔ یہی کرکھلکھلا کر نہیں۔ بولی :
 ”پھر آپ نے اُسے باپس دی :-

ہم نے کیا

”ہمارے پاس تھی ایک برس سے خریدی تھی :-

ایک دم سنجیدہ ہو کر بولیں :

”کیا تم واقعی ایسے ہی بیوقوف ہو جی جیسی باتیں کر رہے ہو“

اس وقت آپ کے ہاں صبح دم یعنی دروازہ خادہ کھلنے کا وقت ہوگا لیکن یہاں چڑھ کر

نیم شب کا عالم ہے۔ ایک بجنے کو ہے لہذا گڈ نائٹ — باقی دارو

کچھ قصہ وال چپاتی کا

لندن پہنچنے کے بہت دن بعد تک ہم انگریزی کھانے کو ترستے رہے، ہمایہ کو جس شام ہم
 یہاں وارد ہوئے چوٹی میں ایک پاکستانی صاحب مل گئے، بوسے چلتے، پٹے آپ کو کھانے کا ٹھکانا بتا
 دوں، ہم نے کہا: بسم اللہ وہ پر پیچ گیہوں میں سے گئے اور ایک جگہ سے جا کر کہا: یہاں آپ کو عہدہ
 پاکستانی کھانا اور حلال گوشت ملے گا۔ اچھا تو نہ تھا۔ قہقہے میں پانی بہت ڈال رکھا تھا، یکی خیر
 دوسرے روز بی بی سی میں ہمارے دوست آصف جیلانی نے بی بی سی کلب میں جیہیں پڑھا اور کباب
 کھاتے، تیسرے دن انعام عزیز کیسٹ کے ایک جگہ سے گئے جہاں جُنا گوشت، منغز اور ماش کی والی
 اور گجھار سے جنگیں وغیرہ بھی تھے۔ چوتھے دن بدر عالم صاحب نے مہمان نوازی کا حق ادا کیا
 اور ہمیں راتین خوش کھلا کر جوش کے روحانی شعر بھی سناتے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ یار دھری
 کانٹے کی نوبت بھی آئے گی کہ نہیں کہ بعد ازاں ملک اپنے گھر لے گئے اور کہا۔ ولایتی کھانا کھا کر
 تم بے مزہ ہو گئے ہو گئے، تو آج پاکستانی کھاؤ۔ اب ہم ان سے کیا کہتے۔ بہت رغبت سے
 ان کی دیشیاں بھی توڑیں۔ پھر یہ سب طحیسن کی ایسٹرن فیڈرل کمپنی نے ایک دعوت کر دی۔ اس
 میں بھی چاؤ، بریانی، سیخ کباب اور پرائٹے ہی تھے۔

ایک جگہ تو جاں بدر عالم ہیں بے گئے تھے۔ بیرے نے کہا

”جواب کیا پان نہیں کھائیے گا؟“

ہم نے کہا، پان؟

ہوئے: جی ہاں! کیسا کھاتے ہیں آپ برابر کا؟

بہت دن سے پان نہیں کھایا تھا۔ اس روز اس کا بیڑا بھی منہ میں رکھا۔ بعد میں معلوم

ہوا کہ ڈھونڈنے والے کو پان بخوبی مل جاتے ہیں۔ لیکن سڑک پر پچکاری مارنے کی اجازت نہیں
جگہ جگہ کھاسے کہ کچرا ڈالنے یا گندئی پھیلانے والے کو دس پونڈ جرمانہ۔

ہمارے ہاں کے ایک بزرگ کو اسمبلی کے اسپیکر تھے۔ ایک روز مینو اسکے ہوٹل کے باہر

میر کر رہے تھے اور پان کی پچکاریاں مار رہے تھے کہ کچھ بچوں نے دیکھ لیا اور پولیس کو رپورٹ کی کہ

ایک شخص خونِ تصوک رہا ہے۔ فوراً کانسٹیبل آئے اور کہا کہ چلو اسپتال۔ یہ بہت جتنا سٹے اور بخیر

میں عقد کسے لگے کہ میں قویہ ہوں۔ وہ ہوں مجھے تم جیل نہیں چھوڑ سکتے لیکن میو اسکے کانسٹیبل انگریزی

زبان کیا جانیں؟ اتفاق سے ایک بھلے مانس لاگڑا لوھر سے ہوا۔ انھوں نے صورت حال بھیجی اور

سمجھائی۔ اور ان سے کہا کہ پانوں کی ڈبیا نکال کر انھیں دکھائیے۔ بڑی شکل سے چٹکارا ہوا۔ لیکن

ہوٹل والوں نے ان کے غصے خاتمے کو بھی رنگین پایا۔ تو بہت جریز ہوئے۔ یہاں تک تو انھوں نے

برداشت کیا۔ لیکن ایک دفعہ ان بزرگ کو شک ہوا کہ یہ گوشت جو ہوٹل والے دیتے ہیں۔ شاید

ذبیحہ نہیں۔ انھوں نے ہوٹل والوں سے کہا۔ مجھے اپنا باروچی خانہ دکھائیے۔ وہ ایسا متعصا اور مجتہد

تھا کہ ہوٹل والے اکثر مہانوں کو فخریہ دکھاتے تھے۔ ان کو بھی بے گئے۔ سارا دودھ کی طرح اسپید۔

انھوں نے کہا کوئی مرغی ناؤ۔ وہ بکھے رہ سوئٹزرلینڈ کی مرغیاں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک چلی ہوئی مرغی



لا کر انھوں نے دی۔ پاس ہی چاقو پڑا تھا۔ انھوں نے اشد اہر کہ اس کی گردن پر پھیر دیا۔ وہ پھر پھڑپھڑا کر اترے اترے نکل گئی لیکن ادھر کئی گردن کے خون کے چھینٹوں سے بھی کے پکڑے غماز ہو گئے۔ سارا بارہوی خانہ بھی رنگین ہو گیا۔ یوں پیدیں خود مرغی یا کوئی اور جانور فریج کرنا جرم ہے۔ وہاں بھی یہ اپنی حیثیت کا حوالہ دے کر چھوٹے لیکن بعد میں اس ہوٹل کے لئے پاکستانی کو دیکھ کر انکار کر دیتے تھے کہ ہمارے ان کمرہ نہیں ہے۔

لندن میں کوئی دوسرا ہوٹل ہوں گے جن میں ویسی کھانا تھا ہے۔ ممکن ہے زیادہ ہوں۔ ان میں سے اکثریت سلیٹ والوں کا ہے۔ کچھ سیرورپ کے بھی ہیں۔ پھر کچھ ہندوستانی بھی۔ ان ہوٹلوں کے نام عجیب ہیں، کاج محل، نام کے تو کئی ہیں۔ پھر موتی محل اور ہیرا محل۔ محل کے لفظ کو تابع محل جان کر ایک صاحب نے تو خود در محل ہوٹل بھی لکھوں رکھا ہے۔ ابھی کوئی دہلی دربار ہوٹل یا اشد کی رحمت کا صمدی ہوٹل البتہ ہماری نظر نہیں پڑا۔

لندن میں آنا والی طرح سڑے ہدیہ دینا ہر چیز مٹی ہے اور خاص مٹی ہے۔ مٹی کی جگہ لکھن ہے اگرچہ بعض شوقینوں کے لئے دکاندار لوگ خاص پنجاب کا مٹی بھی منگوا رکھتے ہیں۔ اجارہ بھی ہر طرح کا موجود رہتا ہے۔

پچھلے جتنے ہم لندن سے باہر سیڑ اور برٹلمم بھی گئے۔ برٹلمم کے بعض محلوں میں ایشیا کے ایڈیٹر حبیب الرحمن صاحب جیسے گئے۔ بالکل گرجا قوالے اور سیالکوٹ کا نقشہ پایا۔ ایک مرثک پر تو ستر فقیہ دکانیں پکائیوں کی تھیں۔ یونس سویت مارٹ سے ہم نے بھی پیر سے اور علیاں کھائیں۔ یہ دکان دین محمد قصائی حلال گوشت دالے کی دکان کے عین سامنے ہے۔

یہاں مستقل ہونے والے پاکستانی بالعموم پاکستانی تصانیروں سے گوشت لیتے ہیں۔ جاہل و کاین ہیں جن پر لکھا ہے۔

”یہاں حلال گوشت ملتا ہے“

(بعضہ ہال گوشت بھی لکھتے ہیں)

لیکن ایک پاکستانی بلم صاحبہ کا کہنا ہے کہ ہمارے یہ بھائی اولیٰ تو گوشت منگا بیچتے ہیں پھر اس میں پاؤ بھر ڈی ضرور ڈالتے ہیں۔ پھر ان کا رویہ خاصہ مذمت ہوتا ہے۔ لہذا میں تو اب انگریز تصانی کے اس سے بے نیگی ہوں۔ سستا ہوتا ہے اور صاف اور عمدہ ڈی چمچرے کی مصیبت بھی نہیں۔

یہاں تصانی کی دکان آئینہ خانہ ہوتی ہے۔ جانوروں کا ڈاکٹر باقاعدہ معائنہ کرتا ہے۔ ہماری طرح رشوت دے کر خانہ ساز اور نہ پڑھی جانے والی جاہلی مہر نہیں ٹھونکی جاتی پھر گوشت کے نہایت نفیس پارچے عریٰ کاغذ میں ملفوف جے ہوتے ہیں۔ ان پر ان کی قسم اور قیمت لکھی رہتی ہے۔ بچنے والا سپید براق ایسٹرن بانڈ سے ہوتا ہے شیشوں کے دروازے، کھڑکیاں اور تختہ رکھنے کو فریج کسی بار تو یہ گوشت کپا کمانے کو بھی پاتا ہے۔

حلال و حرام کا امتیاز بڑی اچھی بات ہے لیکن اب یہ ہیں تک رہ گیلے ہڈیوں میں ہمارے ہوٹل میں ایک صاحب ایک اسامی ملک کے تھے۔ دو تین روز کو آتے تھے۔ انگریزی نہ جانتے تھے لہذا ہمیں ترجمانی کرتی پڑتی تھی۔ مسز دانش نے پوچھا ان کو اٹھا اور بیلن دوں؟ ہم نے کہا اے حران

خبردار! جیسا ناشتہ ہمیں دیتی جو اسے بھی دو مسلمان بجائی ہے۔ اس نے خالی انڈے تو اس لائیے
 ابن صاحب نے ایک روز تو کھائے دوسرے روز ہم سے کہنے لگے۔ بڑی بی سے کہو ہمیں جانی
 انڈوں پر نہ ٹھٹھٹے۔ ان کے ساتھ بیکن بھی دیا کرے۔ جب ہم نے وہ بے غفلوں میں کچھ لیا تو بخشنے
 لگے کہ مسلمان کا ایمان تو دل میں ہوتا ہے۔ معدے میں تو سودا ہی ہوتا ہے اور شروع میں سودا اس
 لئے حرام قرار پایا تھا کہ گندہ ہوتا ہے اور گندلی کھاتا ہے اب تو دیکھو کس طرح خاص طور پر
 خوراک کے لئے پالا جاتا ہے۔

ہم نے کہا بابا تو جوجی چاہے کھا۔ ہمیں مت تامل کرنے کی کوشش کر۔ اُنڈہ ہم تیری قربانی
 کریں تو سونہ لکھائیں۔

نندن کے ایک اردو ہفتہ وار میں ایک پاکستانی مقیم انگلستان نے لکھا ہے کہ ہم پر قہر الہی
 نازل ہونے والا ہے۔ وہ اس لئے کہ یہاں اگر پاکستانی بیڑ پینے لگتے ہیں۔ قہر الہی کی فوٹاری
 ہم نہیں لیتے بلکہ شراب کے پرانے یہاں فروغ دیتے ہیں اگرچہ جکتے بہت کم لوگوں کو دیکھا ہے
 میاں جو بی لکھنے سے پہلے گھر میں بھی خشکی لگاتے ہیں۔ گلی کے کونے کے پب میں بھی پیاس
 بجھاتے چلے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں۔ ٹنڈی آب دہرا میں خون کو گرم رکھنے کا ایک جہاز
 ہے۔ اک گونہ بخیروی اس سے متی ہے۔ مے سے فرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو۔

اب شراب نوشوں اور کافروں نے آنا التزام البتہ کیا ہے کہ کوئی بے دوزگار بھی ہو تو
 جھوٹا نہ مرنے پائے۔ اسے اتنا دغیفہ سرکار سے ضرور ملے کہ گزارہ کر سکے۔ دکان کا کرایہ ملے
 سکے۔ پکڑے پس سکے اور اس کے بچوں کو دودھ میسر آ سکے۔ جتنے زیادہ بچے ہوں گے، اتنی
 زیادہ اس کی جان سکھی ہوگی۔ کام پر لگے تو انکم ٹیکس کم ہوگا۔ بیروزگار رہے تو دغیفہ زیادہ ہوگا۔

ایک صاحب ذکر کر رہے تھے کہ ہمارا ایک لوگ نوکری چھوڑ گیا ہے۔ کہنے لگا جناب ڈیڑھ
 پونڈ میں ہفتہ بھر نوے پانچ بجے تک کام مجھ سے تو نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ بیروزگاری کی
 صورت میں اسے جتنا وظیفہ ہفتے میں مل سکتا ہے، تنخواہ اس سے فقط ڈیڑھ پونڈ زیادہ ملتی ہے۔
 پھر کہیں نہ گھر میں پڑا چادر پائی توڑے۔ اور مچھلی کرے۔ ایک مزدور کا پچھلے دنوں نیلی ویشن
 انٹر ویو آیا تھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ کام کیوں نہیں کرتے؟ بولا۔ جناب کام کروں تو بیوی بچوں
 کو کیا کھلاؤں؟ تفتیش پر معلوم ہوا کہ آٹھ بجے ہیں۔ اگر کام کرے تو سولہ پونڈ ہفتہ پائے گا۔
 بیروزگاری کا وظیفہ سائیس پونڈ فی ہفتہ بن جاتا ہے۔

کچھ حکیموتیاں کلچر کی

ہماری ڈائری سے یہ گمان نہ کیا جائے کہ ہمارا سارا وقت یورپ میں مکان کی تلاش یا غسل خانوں کی پیمائش میں گزرتا ہے۔ لیکن کیا کیا جلتے جہاں رہنا چار دن ہو اور ان میں سے دو آرزو میں کتب جاتیں دو انتظار میں — وہاں اور کیا عمل فکرو جو سکتا ہے گیارہ بارہ دن سزاؤں کے بوسیدہ تنہ خانے میں بسر کرنے کے بعد یہ کمرہ کا ہے۔ عینہ، خراب، عینہ و نشست گاہ۔ عینہ غسل خانہ بھی جونی زمانہ نہیں ملتا۔ کرایہ اس سے پونے دو گنا لیکن خیر — ہمارا اوقات تو غسل خانے میں صرف ہو جاتا ہے۔ جن کا میٹاپن ڈور نہیں کر سکتے تو قنق تو اجمار ہے۔

ان کمزور آب دینوی سے فرصت پا کر ہم کلچر کی حکیموتیاں بھی کرتے رہے ہیں۔ برٹش میوزیم میں گئے۔ کیا پرانی پرانی چیزیں بھر رکھی ہیں۔ ٹوٹی پھوٹی مورتیاں۔ پرانے وضع کے ٹکے اور نوٹے۔ مینیال کیڑے لگائی گئی ہیں۔ ان سے کیس بستر چیزیں تو بیاں ہزار کی ہر دوکان میں مل جاتیں گی۔ اور تمہی۔ اس کے کتب خانے کو بھی ہم نے دیکھ ڈالا۔ وہی دانوی کا کوئی ناول نہ کا۔ کارڈ بنوانے گئے تو ایک ترش رو اسسٹنٹ نے کہا۔ کبھی پہلے بھی ممبر رہے ہو؟ ہم نے کہا ان آج سے چھ سال پہلے ستمبر میں بنا تو تھا۔ وہ چھت پر گیا اور ہمارا کارڈ نکال لایا۔ کارڈ بنانے

والا بہت خوش حال اور علم کی قدر کرنے والا تھا۔ اس نے ہمدانی عیثیت کو ہائے چہرے ہی سے بھانپ لیا۔ اور ہمارے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھا۔ ہم آبدیدہ سے ہو گئے کہ موتی کی قدر محمد سے نکل کر اور ہیرے کی قدر کان سے باہر آکر ہی ہوتی ہے۔

مصر کی قدیم تہذیب کا ہم نے بہت شہرہ سنا تھا۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ ولادت مسیح سے ہزار دو ہزار سال پہلے تہذیب کمال کو پہنچی ہوتی تھی۔ ان لوگوں نے اہرام بنائے۔ میاں بنائیں اور دفن کیں اور نہ جانے کیا کیا کیا۔ برٹش میوزیم کے کئی کروڑوں میں اس تہذیب کے آثار پھیلے ہوئے ہیں جن میں بادشاہوں اور پادشہوں کے علاوہ ان کی روزمرہ زندگی بھی بھلوانوں اور اڈوں کی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ پہلے یہ ہے کہ ہم تو ذرہ بھر متاثر نہیں ہوتے۔ ان کے تین ہزار سال پہلے کے آلات زراعت دیکھے۔ کوئی کمال نہیں ویسے ہی ہیں جیسے آج کل ہم استعمال کرتے ہیں۔ لوہاروں اور برہمنوں کے تھوڑے اور تیشے بھی ایسے ہی ہیں جو پاکستانی دیہات میں متعل ہیں۔ جاس کا بھی ایسا زیادہ فرق نہیں۔ زمین سے پانی نکالنے کے طریقے رہٹ اور ڈھیلے وغیرہ فرود جلد سے آج کل کے دیہاتی طریقوں سے فوراً بہتر ہیں لیکن ایسا زیادہ فرق نہیں کہ اکس پر گت ہیں نکلیں۔ قدیم مصر کی کھدائی کرنے والوں نے شاید ہمارا ملک نہیں دیکھا اور نہ انھیں میں کھودنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ زمین کے اوپر ہی یہ ساری چیزیں اتنی افراط میں مل جاتیں کہ ایک چھوٹا دس میوزیم آباد کر لیں۔

اہرام ہم نے ابھی نہیں دیکھے آثار اللہ اسی سفر کے دوران دیکھیں گے لیکن تصویر سے تو یوں ٹپکے ٹپکے مٹا نظر آتے ہیں۔ سنا ہے بیس بیس تیس سال میں بنے ہیں۔ یہ بھی کوئی کمال نہیں ہمارے ان قائد اعظم کا مقبرہ بھی دس سال سے بن رہا ہے اور کچھ عجیب نہیں مگر تعمیر میں ہم اہرام کو چھپے چھوڑ جائیں۔ اس زمانے کے مصری نہ ماتی لگاتے تھے نہ سوٹ پہنتے تھے

اور یہاں تک دریافت ہوا ہے کہ انگریزی تک نہ بونا جانتے تھے۔ پھر بھی ہمارا ذکر کہیں نہیں اور ان کی تہذیب کا غلط ہے۔

لکھے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

میں سرسید احمد خاں کے ایک رسالے کی تلاش تھی جو انہوں نے ہندوستان کے قدیم وہی نظام پر لکھا تھا۔ سرسید کی تالیفات میں اس کا ذکر کم ہی آتا ہے۔ خیر وہ مل گیا۔ لیکن ہم نے فہرست میں دیکھا کہ مصنف کا نام احمد خاں درج ہے۔ احمد خاں سید غالب کو بھی ہم نے غائب کے تحت نہیں بلکہ اسد اللہ خاں کے تحت پایا۔ لکھا تھا: اسد اللہ خاں مرزا آگے چل کر لکھا ہے کہ غائب بھی کہتے تھے۔ نہرستیں بنانے والے انگریزوں کی دیدہ ریزوں کی پھر بھی داو دیجئے، کیونکہ ان کے اس کتاب پر سید حامد خان نام لکھنے کا درج ہے۔ ولیم شیکسپیر پر ایچ جی ویز۔ جارج برنڈشاؤ وغیرہ۔ یہاں ہم نے اردو الف بیلہ کے پلٹے فٹے نکلوانے تو ایک پر مبالغہ کا نام یوں لکھا پایا۔

تالیف نام و ناشر بے مثال بذلہ نسخہ نازک خیال جو بخش اردو زبان و احوال زبان
جناب میرزا رجب علی بیگ سرور۔

ہم تو خیر سچاں جانتے ہیں کیونکہ ہمارے ان خود اپنے نام کے ساتھ علامہ یا نامہ نامے سن
دیگرہ لکھنے کی روایت ہے۔ لیکن ایک انگریز کا اس میں غلطی نہ کر بھیج نام نکال لینا کہ ان کی بات
ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ ان کا نام نہرست میں ب کی تختی میں یوں ہوتا بذلہ نسخہ نازک خیال
جو علی بیگ سرور بھی کہتے تھے۔ دیگرہ۔ خیر موصوف نے جس طور آغاز داستان کیا ہے وہ بھی سننے
کے لائق ہے۔ یہاں سے یہ کچھ نثر زبان، پتہ دروہان، آواز چار سو، سرمہ حیرت در گوشت زانی،

چمن لہ کر دھن یاد دیا ر سے دود مرزا رجب علی بیک سرور، سخن نغم قدر دانوں کی مسخ خواہش
 اپنے زخم جگر پر نلک پاشی کرتا ہے۔۔۔۔۔ آگے تو فیض کی ہے کہ ترجمہ تواضع یلہ کا اردو میں تھا
 لیکن سید حامد حاکم نغم زبان میں تھا۔ ایک رئیس نے فرمائش کی کہ بابا جہ سے یہ نہیں پڑھا
 جاتا، اسے مسیح اور عیسیٰ شریں دوبارہ لکھو۔ اس فقیہ نے اس فرمان کو واجب قیاس جانا۔۔۔۔۔
 کتب کے آخر میں پھر بیان سراپا عبوب محمد یعقوب سنخوہ نصیح الحسن محمد صادق خاں اور جاب
 منشی وحیث رائے معنی کے لکھے ہوئے قطعات تاریخ بھی شامل ہیں۔

میرزا حیرت نے جو الف یلہ ترجمہ یا تالیف کی اس کی پیشانی پر لکھا ہے۔ الف یلہ شریطر
 ناول۔ یہ اس زمانے کے آدمی تھے جب پرانی اردو میں نئی روشنی کے چوند لگ رہے تھے اس
 میں ہر جگہ گفتگو مکالموں کی شکل میں ہے۔ اندرون سرورق ایک طرف تو ناشر محمد امینظیر و ناظم
 فیتہ اشغال حضرت مولوی محمد اقبال حسین المتخلص بہ عاشق دایم فیض کے دیوانوں سر اسرار عاشق اور
 افکار عاشق کا اشتہار ہے۔ جن کو معانی لغز کا دفتر اور محاورات اردو سے معنی کا مخزن کہا گیا ہے
 دوسری طرف کتب زیر بیع میں لندن کی مسین پریس کی مسین برلن کی مسین کے نام درج ہیں۔
 چھ : ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے۔ انگریزی سے خوشہ چینی کی بھی تو کیا کی۔ میرزا حیرت
 کے مسدس حیرت کا اشتہار بھی دیکھیے۔ اس مسدس میں مولانا حالی کے مسدس کی تردید بڑی بیانت
 سے کی گئی ہے۔ جس زبان پر ان کو بڑا ناز تھا۔ اس کو وہ ہلی کے محاورے کے خلاف ثابت کر کے دکھایا
 ہے۔ اتنے یہ آگے وقتوں کے لوگ جن میں سے کچھ آج بھی باقی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس
 زمانے میں فنی کتابیں بھی لکھی جاتی تھیں۔ ایک کا اشتہار دیکھیے رسالہ کبوتر بازی مع کھیل بیل از مرزا
 مولانا خیر کپسور تو بڑی بات ہے اگر اس محفل میں پہلے ہوں کی عقل با کھیل کو دیکھ کر حیران و حائل

تو قابل معافی ہیں۔

آج کل ہر کسی کی حد سالہ برسی پر یہاں برٹش میوزیم میں ہر کسی کی کتابوں کو بچھانے ایڈیشنوں کی نمائش ہو رہی ہے۔ ان کے خطوط بھی انگریزی اور فرینچ میں لکھے ہوتے رکھے ہیں ہر کسی بہت دن لندن میں رہے۔ اور امریکی کے انگریزی انباروں کے نامہ نگار تھے۔ زیادہ وقت یہیں برٹش میوزیم کے دارالمطالعہ میں گزارتے تھے۔ کسے معلوم تھا کہ انہی کی تحریریں انگریزی اور امریکیوں کے پاؤں تلے سے زمین نکالیں گی۔

ہاں ہم نے اس بالکل سرورق اور سنو کا ایک کھیل بھی دیکھا۔ سعید جعفری ایک ذہین نوجوان ہیں اسٹیج پر نامیاد کر رہے ہیں۔ وہ سٹریڈبرگ کے ڈرامے 'دفعہ موت کے ٹکٹ' کہیں سے آئے 'درد تو آگے چار ماہ کے لئے سدا ہی پیشیں' تک تھیں۔ اداکاری کیا تھی 'الہاڑ تھا اعجاز'۔ یہ کھیل وقفے وقفے سے اولڈ وک تھیٹر میں ہو رہا ہے۔ یاد ہے کہ گزشتہ مئی میں سرورق کے چتے کا اپریشن ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے کئی ہفتے مکمل آرام کی ہدایت کی تھی۔ لیکن ابھی دنوں ان کی منڈی کے ایک دو کیلوں کی ریسرپس ہو رہی تھیں۔ موصوف اور پر کی منزل سے کھڑکی کے رستے نکل پاتپ کو کچھ کر آئے اور آج تک فراد ہیں۔

نہیں ہم اپنے وطن میں بھی عموماً یا تو کارٹون دیکھتے ہیں یا لارل مارڈی سے رعبت رکھتے ہیں۔ سو یہاں کے کھلیک میمنڈاق میں ہمارا یہ حال ہے کہ اوپر ڈوبے اوپر نکے۔ اور پھر باادب بااعظہ جو شیار۔ اوپر کی آنکھیں اوپر نہیچے کی نیچے۔ ہم نے فیضی ہل بھی دیکھی سو اتنے زمانہ فرش کتاب کی غم باہر کھٹا تھا خاص برائے بالغان لیکن خیر میں کسی نے نہ روکا۔ ہم اس فلم

کو دیکھ کر پہلے پہلے پھر روئے۔ کیونکہ اس میں تو فیضی بی باکل نیک پرین ہے۔ جتنے لوگ
اُسے گناہ پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی اُمر و پرہیزگاری کرتے ہیں ان سب کو وہ
مردانہ وار پھپھاڑ دیتی ہے۔ انجام باطل ہماری نعلوں کا سا ہے۔ آخری سین میں اس کا نکاح کر جا
ہیں ایک ادباًش سے کیا جا رہا ہے کہ ہر دینی بی بی کا اصلی اور مخلص عاشق زار دروازے توڑ
کر اندر آتا ہے اور بیانیگ و بل اعلان کرتا ہے: ”یہ شادی نہیں ہو سکتی“ اور آخر وہ باجمعت
خاتون اپنے پاکباز شوہر کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے چلی جاتی ہے۔ اس سارے قصے
میں فحش صرف ایک چیز تھی۔ وہ گایاں جو فحش دیکھنے والے باغ اپنے پیسے برباد ہونے پر
سینا والوں کو دیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے۔ جیسے اس فلم کا سینا ریو کسی وکٹورین ادیب سے لکھایا
گیا ہو۔ جگہ کہ عجیب نہیں ملے وکٹوریہ نے خود لکھا ہو۔ یہ فلم تو شیر خوار بچوں تک کو آسانی سے
دکھائی جاسکتی ہے۔



ٹاور سے موسم گھرتک

تنہائی، تنہائی۔ اتنی نوے لاکھ بلکہ شاید کروڑ سے زیادہ آبادی کے شہر میں تنہائی، لیکن
تنہا گریستن میں ایک مزار بھی ہے جسے تو غالب نے اس کی تنہائی تھی کہ وہ
”رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو“

دو انصوں نے شاید اپنے لئے مانگی تھی پوری ہمارے حق میں ہوئی۔ غالب نے بے در
درد یار سا اک گھر چاہا تھا۔ پچھلے ہفتہ تک ہمارا جو کمرہ رہا ہے۔ اس کا ناک نقشہ اس سے چند
مختلف نہ تھا۔ غالب کو یہ بھی حسرت تھی کہ کوئی ہمسایہ نہ ہو اور ہمزبان کوئی نہ ہو۔ ہمسایہ تو خیر
بے شمار ہیں۔ لیکن بڑے شہر کے ہمسائے کیا۔ برسوں رہ کر ایک دوسرے کے غم میں شریک ہونا تو
دردناز ایک دوسرے کے نام سے بھی واقف نہیں ہو پاتے۔ ہم زبانی لایہ ہے کہ جہائے ہوئی
میں قریب قریب بھی افریقی ہیں یا پھر ایک امریکن لڈا ہے۔ ناشتے پر گڈ مارنگ۔ گڈ مارنگ
ہر جاتی ہے۔ اور بس۔ غالب صاحب کو یہ بھی آرزو تھی کہ پڑیے گریہ تو کوئی نہ ہو تیار دار۔
سو برس اولاد آدم یہ بھی گزری۔ ہم کھانسی بخار نہ کام میں ڈیر لکھ دن تک اپنے کمرے میں پڑے
رہے۔ کسی نے نہ پوچھا کہ جیسا کیسے ہو؟ آخر ٹاؤس کیپر کے کھنے پر سینٹ میری اسپتال کے آؤٹ

پشٹ ڈیپارٹمنٹ میں گئے۔ انھوں نے کہا فلاں مٹرک کے فلاں کوپے میں ڈاکٹر ارٹ کے پاس جاتا اور یہ پرپی دے دو۔ وہ سیمائی کریں گے۔ وہاں پہلے ہی پندرہ آدمی انتظار کر رہے تھے اور اپنی اپنی باری پر ڈاکٹر سے پوچھتے تھے کہ آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟ ہمیں بھی انھوں نے ایک منٹ میں جگتا دیا۔ یہ بات کچھ اچھی نہ لگی۔ کیونکہ ہمیں ذرا دلی جمع سے عرض حال کرنے کی عادت ہے کہ ڈاکٹر صاحب یہ کیا بیماری ہے۔ کھانے میں کیا کھاتیں اور کس شے کا پرہیز کریں۔ کھچڑی ہمیں پسند نہیں کچھ اور بتائیے۔ کیا وہی بڑے ہاشش کی دال اور بڑے گوشت کے کباب کھا سکتے ہیں؟ دن میں کسے بار دوا یعنی ہے وغیرہ... جس ڈاکٹر کو اتنا کچھ سننے کا یارا نہ ہو اس کے پاس ہم جاتے ہی نہیں۔ لیکن یہ معاملہ پرومیں کا تھا۔ اس مرد ممکن نے پرپی پر کچھ کھو دیا کہ کسی کیسٹ کے پاس چلے جاؤ یہ کیسٹ نے ایک پچکاری سی دی کہ نہ کھول کر گے میں مار دو۔ ہم نے کہا۔ دی میں کے بازو اندر اپنے گھے میں یا کسی اور کے۔ فرمایا یہ تو ڈاکٹر سے پوچھنا تھا حضرت۔ ہم نے کہا پیسے؟ بوسے پیسے کچھ نہیں۔ اس ملک میں علاج معاہدہ مفت ہے۔ یایوس اور غیر یایوس علاج ہر قسم کے مریضوں کا۔

ہمیں یہ بات معلوم ہوتی تو ہم اب تک کئی بار بیمار پڑ چکے ہوتے۔ امریکہ میں تو ہر چیز کی طرح علاج بھی اتنا مہنگا ہے کہ اس کے لئے جان بچنی پڑتی ہے۔ اسی لئے بہت سے امریکن اپنی ہسپتالوں کے علاج کے لئے ٹورسٹ بن کر انجمن آجالتے تھے۔ یہاں ہسپتال میں داخل ہو جاتے اور مزے کرتے۔ کزیہ وغیرہ دے کر بھی امریکہ کے مقلدے میں بہت سستا رہتا تھا۔ اب شاید کچھ پابندیاں لگ گئی ہیں۔ شفا یہ کہ اسی بیماری کا علاج مفت ہو گا جو یہاں آکر لگی ہے یہ نہیں کہ آپ باہر سے بیماری لے کر آئیں۔ ہم بھی اپنی بیماری دلی اور درد تنہائی کا علاج یہاں کرانا چاہتے تھے۔ ان کے ساتھ بھی یہی قیامت لگی ہے کہ یہ آزار پاکستان سے ہم اپنے ساتھ لے

کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں نے ان کی دوا کرنے سے انکار کر دیا۔

ڈاکٹر شاہ رستمن کے مرنے کا تھا۔ آج ہی کا بجئے۔ صبح نکل گئے۔ صبح سے ہمارا مطلب ہے
 گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کیونکہ گھنٹہ کیلئے ہم نے لندن میں بھی آدابِ بحرِ خیزی۔ آدمی رات
 سے کچھ پہلے واپس آئے۔ آج جتنے کا وہ تھا۔ دو فقر آج جندہ ہوتے ہیں۔ کوئی کارِ منصبی تھا نہیں۔
 لہذا لندن نماد کا رخ کیا۔ نماد ہم نے ۱۹۶۱ء میں بھی دیکھا ہے لیکن اس میں ایک عجیب کی کشش
 ہے۔ اس کی زیادہ عمارتیں تیرہویں صدی کی ہیں۔ بعض اس کے بعد اور اس سے پہلے کی بھی۔
 یہ عجیب جاتے عبرت ہے۔ کہتے ہی بادشاہوں اور ملکاؤں اور امیروں نے ان برجوں میں
 امیری کے دی گزرائے اللہ چہرہ اشرنے ہیں جہاد کے کھارے کے سپرد اپنی گردنیں کیں۔ وہ
 جگہ اسٹے کے اندر زنجیروں سے محفوظ کر کے الگ کر دی گئی ہے۔ جہاں ملکہ این بولین دہتری
 ہشتم کی دوسری بیگم) اور ملکہ کیتھرائن ہودارڈ (انہی بادشاہ سلامت کی پانچویں بیوی) پلیدی ہیں
 گئے دو تین مشہور نوبوں اور نواب زادیوں کے سر قلم کئے گئے۔ ملکہ این بولین سے ایک عایت
 البتہ برتی گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میرا سر کھارے سے نہیں توڑے قلم کیا جائے چنانچہ اس کے لئے
 خاص طور پر تیار منگائی گئی۔ ایک امیر لارڈ اسپنگر نام کے ڈیوگ آف گورسٹر کے وہابیوں میں سے
 تھے۔ نہایت متکلم مانے جاتے تھے۔ ان سے کوئی تعویذ ہوا تو آفاتے ولی نعمت نے کہا جناب
 لارڈ صاحب، آپ سے زیادہ رموزِ مملکت کوئی ہوتا ہے۔ آپ کے جسم کی سزا قاعدے سے کیا
 ہوئی چاہئے اس نے کہا جناب اس کی سزا تو از روئے قاعدہ گردن مارنا ہے۔ چنانچہ قانون کا
 تقاضا پورا کیا گیا۔

ان برجوں میں ہر ایریا غیرا قید ہونے یا گردن کٹوانے کا شرت حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ یہ

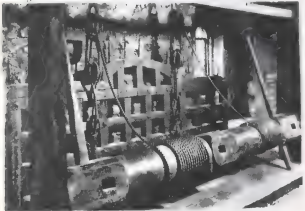


سعادت فقط شاہی خاندان کے لوگوں یا امرا کے حصے میں آتی تھی۔ کیونکہ جیل کا سارا خرچ نقد سے
 کا خرچ جتنی کڑجوا کی نہیں۔ لکھاڑے اور کلڑی کے کندھے کا خرچ بھی مجرم یا قیدی ہی کے ہوتے
 ہیں۔ قند داخل ہوتے ہی داہنے اٹھ کو باب خدراں کی چوڑی محراب ہے۔ دریا تے ٹیمز سے ایک
 خندق بیاں آتی تھی اور قیدیوں اور گشتہ ہونے والوں کو ٹیمز کے راستے اسی محراب کے نیچے
 سے بیاں لایا جاتا تھا۔ اس کے مین سامنے اسی زمانے کا خونی برج ہے۔ کیسے کیسے سرفرازان
 دونوں دروازوں کے نیچے سے گزرے تھے۔ سولہویں صدی میں ڈیوک آف گلٹھم، ملک این بولین
 کراویل، لارڈ آف ایلسس، ملک کیتھرین ہواڈ۔ ڈیوک آف سرسٹ، بیڈی جین کرے، ڈیوک آف
 مینتھ اور دہلنے کو کون کون خود ملک الزبتھ اول کچھ دن بیاں قید رہیں۔

خونی برج کے اوپر کے کمرے میں سر وائٹریس نے اپنی امیری کے بارہ سال گزارے۔
 اس کا پٹنگ اس کی کرسی دونوں موجود ہیں۔ یہیں اس نے تاریخ عالم لکھی جس کا پہلا ایڈیشن اسی
 کمرے میں دھرا ہے۔ اوپر خدا اسی جگہ ہے جہاں سے چند قدم ٹھننے کی اجازت تھی اور اب ٹمک

وائٹ ریپے والک کھاتی ہے۔ اس اولوالعزم کا آخر علم شہنشاہی سے ۱۹۱۸ء میں سرق سے
 جدا ہوا۔ اس احاطے میں مرنے والیوں میں سے ایک بی بی خاص جرات والی تھیں۔ ان کو جرم
 بے وفائی میں جتاد کے پٹرو کیا گیا تھا۔ انھوں نے مرنے سے پہلے اعلان کیا کہ بے شک میں ملک
 انجمن کے طور پر مردہ ہی ہوں لیکن یہ میرے لئے کوئی ذریعہ عزت نہیں۔ میرے لئے اسی سے
 زیادہ سرمایہ افتخار اپنے یار کی محبوب ہونا ہے۔ ان کا یہ اُٹنا بھی اسی چار دیواری میں افرست
 کی موت مرا۔

ٹاور کے ایک طرف کی عمارت میں اسلامک میوزیم بھی ہے۔ جھنجھوڑ کے خود زندہ بلتر



خونی دروازے کی چرخی

اور ہمارے لئے تو ہر جگہ دیکھے ہیں۔ گھوڑوں کے ذرہ بکتر بھی کئی جگہ نظر آتے ہیں اتنی کا ذرہ بکتر
 میں دیکھا۔ پورا اتنی لڑے کی ذرہ میں رہتا تھا۔ یہ ذرہ کو ایو صاحب ہندوستان سے لاتے تھے۔
 اور خیال کیا جاتا ہے کہ جنگ چاسی میں نواب سراج الدولہ کی فوج کے کسی اتنی کی زیرت رہی ہوگی۔
 بہت سے ہتھیار اور ذرہ ہیں جہاں ساختہ لاہور ہیں۔ ایک دو ساختہ سندھ بھی۔ ہتھیاروں میں
 شمشیر، خنجر پیش قبض، قرولیاں، بھانت بھانت کے تحفے ہندوستان کے یہاں دیکھے۔

ٹاور آف لندن کے کوٹے بھی مشہور ہیں۔ یہ کوٹے ایک خاص نسل کے ہیں اور فقط ان بڑوں
 پر نظر آتے ہیں۔ کئی صدیوں سے یہ مشہور چلا آرہا ہے کہ جس روز یہ ختم ہو گئے اسی روز ٹاور گر جائے
 گا۔ اور سلطنت انگلشیہ ختم ہو جائے گی۔ سلطنت انگلشیہ کے ختم ہوجانے میں کیا کسر رہ گئی ہے
 یہ تو ہمیں معلوم نہیں لیکن کوٹے بہر صورت زندہ ہیں۔ اور ڈاٹ ٹاور بھی سلامت کھڑا ہے۔

باقی دن ہم نے مادام تساد کی موی بیسوں کی گیلری اور ان کا چیمبر آف مارر ذیعنی ایوان
 و بہشت دیکھنے میں گزارا۔ یہ بیکرا سٹریٹ میں ہے اور اس میں موت کی سزا پانے والے مجرموں
 کے پتلے کھڑے ہیں۔ یہاں جب دھوکا ہوتا ہے۔ اندر داخل ہو کر ہم نے گارڈ کے پاسی ٹوٹکٹ
 دیکھا یا تو اس نے تو جی ہی نہ کی معلوم ہوا موسم کا ہے۔ اوپر چڑھے تو ایک پتلا باطل انسان کی
 صورت میں کھڑا تھا۔ ہم نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پیرا تو بولا: کیا کر رہے ہیں جناب، آئینہ خانے
 کی گیلری میں ہم نے ایک صاحب کو دیکھا کہ جس طرف کو ہم جاتے ہیں اسی طرف کو وہ لگتے ہیں۔
 آخر ٹھکرائے۔ ہم نے کہا۔ سودی لیکن شیشے کی ٹھنڈک محسوس ہوتی۔ تب معلوم ہوا یہ تو ہم خود
 ہی تھے۔ جہلاٹکس ہی تھا۔

لندن میں میوزیم ایک نہیں۔ بہت ہیں۔ ایک میوزیم سائنس کا ہے، ایک نچرل ہسٹری کا ہے



مادام تستاو

میں جانوروں کے ڈھانچے رکھے ہیں۔ بٹھے پودے پھلیاں سیب ڈھانچے وغیرہ لاکھوں سال پرانے ہیں۔ ایک آئرنٹ بکچورا (مروہ ڈھانچہ) بھی نظر آیا۔ جو کوہ شوالک کے دامن سے پکڑا گیا تھا۔ پرانے جانوروں میں بھینسے تو بارہ بارہ چوہہ چوہہ سون کے تھے۔ انسان ان کے مٹنے کی کا بچہ ہے۔ اس کی عمر جمعہ جمعہ آئرنٹ دن کی یعنی فقط تیس لاکھ سال بتائی جاتی ہے۔ جب کہ پھلیاں ۵ کروڑ سال پہلے موجود تھیں اور پرندے ۴ کروڑ سال پہلے۔ دودھ دینے والے جانوروں میں بھی انسان سب سے پچھڑی ہے کیونکہ دوسرے جانور میں کروڑ سال پہلے وجود میں آگئے تھے، جلتے لٹنے بہت سے جانوروں کا دودھ کہاں جاتا ہوگا۔ کہاں بکتا ہوگا۔ کوئی ان میں پانی ملاتا ہوگا۔ کیونکہ انسان اس زمانے میں نہیں تھے تو کون سے بھی نہیں ہوں گے۔

نیچرل ہسٹری میوزیم کے ایک برآمدے میں ایک درخت کا تنہا پڑا ٹکڑا پایہ اتنا پرانا توخیر نہیں کہ آثار قدیمہ دانوں کی توجہ کے قابل ہو، تاہم ہماری عقل اسے دیکھ کر اور یہ جان کر حیران ہوتی کہ چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں جب روم اپنے عہد زوال میں تھا تو یہ پودا ۴۳ سال کا تازہ درخت

تھا۔ نبی کریمؐ نے جب مدینہ ہجرت کی تو ۶۵ سال کا تھا۔ برطانیہ کا مشہور بادشاہ الفریڈ اعظم تخت نشین ہوا تو یہ بابائے درخشاں زندگی کی تین صدیاں چوڑی کر چکے تھے۔

مشہور ٹی لندن برج جوان ڈٹھا کے دوبارہ بنایا جانے والا ہے، اس درخت سے عمر میں ۴۵۷ سال چھوٹا ہے۔ میگنا کارٹا پر دستخط ہونے کے وقت یعنی ۱۲۱۵ء میں اس کی عمر ساڑھے چھ سو برس کی تھی۔ ٹیکسپیئر کے مرنے کے وقت ۱۰۶۹ سال اور لندن کی مشہور آگ ٹی تو یہ بزرگ گیارہ سو سال کے ہو چکے تھے۔

ہمارے اس بھی بڑے بڑے معرکہ خیز بی بی بی ڈائریوں والے لیکن یہ درختوں کا سرسبز دنیا بابائے اردو ان سب کا رشتے میں داددار ہے۔ افسوس اس نے ابھی اپنی عمر عزیز کے ۱۲۳۵ سال پورے کئے تھے کہ کسی ظالم نے ۱۸۹۲ء میں اس پر آ کر اپلا دیا۔
صرت ان غنچوں پہ ہے جبریں بکھنے مڑ جھانگے

گورے دیکھے، کالے دیکھے

لندن دیکھا۔ لندن وٹے دیکھے۔ گورے دیکھے۔ کالے دیکھے، ہاں دوستو! کالے، یلکے
 سچ بچے کالے۔ چہرے بچے کالی، پر بھی کالے۔ گورے بھی دھوئی رو سیاہی کالے۔ یلکے فردا
 کی تقدیر معلوم ہوتا ہے کہ افریقہ کے اقدار میں ہے۔ احساس کمتری یعنی جہ؟ ہمیں تو اپنے ان
 بھائیوں میں صاف احساس برتری دکھائی دیتا ہے۔ لندن میں بیرونی غالب علویں میں دیکھو
 یا گلیوں، کوچوں میں کام کرنے والوں کو، ٹیوب میں، بس میں، فلیٹ میں، دکان میں ہر جگہ گورے کے
 ساتھ ساتھ نظر آتا ہے۔ کبھی کبھی ہم سوچتے ہیں کہ ہم کون ہیں؟ کیا ہیں؟ تین میں ہیں یا تیرہ میں ہیں؟
 بیسوں میں ہیں یا شیعوں میں۔ گورے ہمیں گورا نہیں جانتا خواہ جمادی رنگت اس سے زیادہ سی
 سرخ و سپید کیوں نہ ہو، جنوبی افریقہ میں الگ، پنج پر بجائے گا۔ کالوں میں جمادی رنگت ہوا کرتی تھی۔
 وہ بھی اس لئے کہ اصل کالے اس وقت تک مارکیٹ میں نہ آئے تھے۔ کل بائیڈ پارک کارن میں ایک
 افریقی سے ہم نے بھائی چارہ جتایا تو وہ بولا: تم کس منہ سے خود کو کالے کہتے ہو۔ جاؤ اپنا منہ دھو رکھو
 اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اقوام عالم میں عزت کی جاپانے کے لئے اپنے چہرے پر کالک ملیں یا
 عورتیں؟ اپنے عزت موٹے اور آنکھیں باریک کرائیں؟ اپنی جگہ پر سفیدی کا آرڈر دیں یا

ٹہلی ریٹ پر خود کو وصولی سے وصولی میں اپنی ناک پر پیہ پھروں میں یا پھر اپنا بضع و خزانہ تلاش کریں اور سرخروئی کے ایسے سامان یا جہم چننا میں کہ بھی ہیں پٹ کر دیکھیں اور ہم پر رشک کریں۔

بادشاہ بڑائی و ملک اور نسل کی نہیں ہے، قرون وسطیٰ میں لندن اور پیرس گناہم تھے تھے گندگی کے ڈھیر تھے۔ پادری بول نہاتے رالوں کے گوشے لگوا کرتے تھے کہ یہ مسلمان ہو گئے ہیں جمعہ کے بعد نہاتے گئے ہیں۔ ۱۸۶۰ء سے پہلے جاپان کا شمار دنیا کی قوموں میں کیس بھی نہ تھا۔ چینی ابھی کل تک آدھے انچھی اور آدھے ڈاکٹر زرا پختہ تھے اس سے بہت پہلے ایک زمانہ تھا کہ ایران کے جندے بحر ت گزے تھے پھر درمنوں نے بادشاہی کی عرب کیا تھا بس ایک جرنیہ تھا۔ یمن یہاں سے روشنی کی ایک مشعل علی اور قرطبہ بغداد و دمشق اور تسطیفہ کے مناروں سے دنیا بھر میں علم و تہذیب کا نور تقسیم ہوا۔ سو سب یقیں اور رنگیں یا زبانیں اور سرزمینیں اپنی بہت اور اپنے اعمال سے سرسبز ہوتی ہیں۔ یہاں کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے۔ کسی فرقت یا سفر کی خلاف ورزی نہیں۔ ہم میں کیا نہیں ہے۔ بعض بند کا ملک ہے۔ عرب کی صحبت ہے۔ ایران کی لادینیت ہے۔ یمن نے خاتمہ بے لگام اور بضع خود پسند؛ بس ہیں اپنے ہی کو کون کھانا ہے۔

برطانیہ کے بول آج کل ایک سرکاری رپورٹ سے یہ معلوم کر کے جب اٹھے ہیں کہ ہر سال چھ ہزار دو سو ساٹھ سدان انجینئر اور تربیت یافتہ کاریگر انگلستان سے دوسرے ملکوں خاص کر امریکہ کی راہ جتے ہیں کیونکہ وہاں ان کو تین گنا زیادہ تنخواہ مل جاتی ہے۔ ایک انجینئر ساٹھ سدان یا کاریگر کی تربیت پر برطانیہ کا چھ ہزار پونڈ سے سو ہزار پونڈ تک صرف ہوتا ہے۔ امریکہ میں کسی کو تربیت دیں تو انہیں ہزار پونڈ خرچ کریں۔



یہ چیز جسے بریں ڈیڑی یعنی تربیت یافتہ لوگوں کی ملک سے ہجرت کہا جاتا ہے برطانیہ کے لئے
 انحصار ہے تو ہم ایسے ملک کے لئے جو ترقی یافتہ نہیں بلکہ ترقی کی راہ پر ہے، ماحفظہ ہے پس
 ایک پاکستانی بزرگ لندن سے گزرتے ہوئے ترک وطن کر کے مستحق کینیڈا ہمارے تھے اور بہت
 خوش تھے۔ کہتے تھے کہ پاکستان میں کیا دھڑا ہے۔ کینیڈا میں موٹی تنخواہ ملے گی، اگر ملک پسندو ہے
 تو کیا ہم بھی پسندو رہیں؟ انکی نسلوں کے خاندان کے لئے اپنا آرام اور اپنی امارت کے امکانات
 تیار کیوں؟ ایک اور صاحب ہیں، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں، کوئی پندرہ سال سے یہاں پڑھے ہیں،
 ہم نے ان سے کہا یہاں کیا لذت ہے، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تو پاکستان میں بھی عیش کرتے ہیں۔
 یہاں گھر کے برتن تک دھوئے ہوئے آج کل چار ہو کر اسپتال میں ہیں معلوم ہوا کہ کوئی دیکھنے
 نہیں جاتا۔ ان ترقی یافتہ ملکوں میں سارے رشتے افتقادی ہیں۔ بیوی بھی چند روز میں تنگ آجاتی
 ہے۔ ہم جیسا حال نہیں کر یا دوست بھی عیادت کو بدلے جا رہے ہیں، کمپری کے عالم میں ان پر
 رقت طاری ہوئی تو ہم نے کہا: میان بخوی بخوی پھر اسافر گھر کا رستہ بھولی گیا، وطن میں آمدنی
 چاہے اتنی نہ ہو لیکن اس میں اس سے زیادہ عزت اور آرام سے گزارنے کی اور پھر اگر تم نے کچھ
 پڑتے لکھتے ہو تو اس سرزمین کو بھی تو نادمہ پہنچاؤ، جس نے تمہیں جنم دیا۔ آہ بھر کر رہ گئے، انگریز
 بیوی کر دکھی ہے اسے پاکستان کا گرد و خبار پسند نہیں۔

یہی بات ہم نے ایک ڈاکٹر سے کہی، بڑے فوجی آدمی ہیں، لندن سے باہر ایک شہر میں رہتے
 ہیں، ایم بی بی ایس لاہور سے کیا تھا۔ کہنے لگے: ان لاہورڈ لاہور ہے، یاد آتا ہے، انڈیا کی
 رسالے بھی دیکھے ہوتے مدت ہوئی، اب تم نے دکھائے تو وطن کی سوز گئی خوشبو آئی لیکن ہم نے
 یہ نادر ہیں دلی میں پر لکھائیں گے کیا، اس کے بعد انھوں نے پاکستان میں ڈاکٹروں کے گرد جانے

شروع کئے۔ پاکستان میں اپنی حازرت کے تجربے سنئے۔ ان کو ہم شانِ جواب نہ دے سکے کیونکہ کچھ قصور جہاد بھی نکھالیکن ان ڈاکٹر صاحب کے نفع نقصان کو چھوڑ کر سوچا جائے تو کتنے لوگ ہماری ملک کے قصوں اور دیہات میں محض ڈاکٹر نہ ہونے سے اور طبی امداد نہ ملنے سے مر جاتے ہیں۔ ڈاکٹر کینڈا اچھے جائیں تو فیکری چٹکی سے علاج کرسنے والوں، طبِ چین و جاپان کے اشتہارینے والوں اور مفتا طیس انجینئروں اور کنگنز والوں، طاووس کاٹوں، تعویذ گننے والوں اور فٹ پتھر کے پرفیسروں کی کیوں نہ چاندی ہو۔ ہم نے چین میں ایک ڈاکٹر سے کہا تھا کہ تم میاں دوسو روپیہ ماہوار سے کر لیا کر رہے ہو، کینڈا اچھے جاؤ۔ دس ہزار روپے میں گئے، مسکرا کر کہنے لگا کہ میاں وہ یہ ہی تو سب کچھ نہیں ہے اگر میرا ملک کنگال ہے تو میری امیری کس کام کی۔ چلو تو سامے نہ ملنے کو ساتھ سے کے چلو۔

ہمارے ملک میں جو لوگ مزدوری پیشہ ہیں، کوئی ٹیکنیکل مہارت نہیں رکھتے۔ وہ شوق سے دوسرے ملکوں میں جائیں۔ اپنی حالت سدھاریں۔ کیا میں گئے تو ان کا کچھ پیسہ نہ رہا دہ کی صورت میں ملک میں بھی آتے گا۔ لیکن ڈاکٹر انجینئر۔ سائنسدان تو ہمارے ہاں لاکھوں میں ایک نکھتا ہے۔ وہ بھی ہمارے اتحاد اور ہمارے ساتھ نہ رہا تو یہ چار سالہ اور پنج سالہ منصوبے آپ کیسے پورے کریں گے۔ چھوٹک مار کر تو کارخانہ نہیں بنایا جاسکتا نہ امام خاں باندھ کر اسے چلایا جاسکتا ہے۔

کچھ لوگوں کو باہر جانے کا یوں بھی شوق ہوتا ہے۔ ہمارے ایک دوست جنھوں نے نیتِ اعلیٰ تقسیم پائی تھی، یہاں لندن میں کچھ دن ایک ہوٹل میں بیرے رہے۔ پھر ایک جگہ چرکیداری کی۔ بس کنڈکٹر بھی رہے۔ آخر وطن واپس پے گئے، پرسوں ایک پاکستانی میر کپنی کے لندن دفتر کے مینجر سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا میں نے تو سارا عملہ پاکستانی رکھا ہے۔ ہم نے کہا، ساتھ

لانے ہوں گے آپ۔ جیسے سرسید اپنے نوکر کو ساتھ لاتے تھے۔ کہنے لگے جی نہیں۔ ایک مثال سنئے، میں یہاں ایک پاکستانی ہوٹل میں کھانا کھانے جایا کرتا تھا۔ ایک پرلے دوسروں سے زیادہ شائستہ معلوم ہوا۔ اس کی انگریزی بھی با محاورہ تھی۔ میں نے پوچھا۔ پاکستان میں کیا کہتے تھے بولا: راجشاہی یونیورسٹی میں پکڑا تھا۔ موصوفیہ ایم کام کا امتحان پاس کئے ہوتے تھے۔ کسب کمال کر کے اب گاہکوں سے ٹپ پیتے تھے اور ان کو تھینک یو کہنے پر معذور تھے۔ میں نے کہا۔ ہماری سیر پلینی میں نوکری کر دو گے؟ بولا ضرور کروں گا۔ بلا خواہ بھی کروں گا۔ مجھے یہ کام سکھا دیجئے میں نے اسے الٹی صبح آنے کو کہا اور اب وہ میرے ان خاصا کام کر رہا ہے۔ کوئی دن میں آفیسر گریڈ میں چلا جائے گا۔

اگر یہ بات ایشیاء کی ہے تو یہ ایشیاء کیسے تو شروع ہونا چاہیے۔ اوپر سے نہیں تو نیچے سے۔ نیچے سے نہیں تو اوپر سے۔ بات پھر چین کی آگئی۔ کہتے ہیں چینی انجینئر اور مائنرں جو امریکہ اور یورپ میں پیش قرار آمدنی کے ملک تھے۔ اس پر لات مار کر اپنے وطن آگئے وہاں جیسی دوسروں کی اوقات ویسی ان کی۔ بنگ بلیٹس بیشک نہیں ہیں۔ نہ لمبی کاروں کی ریل پس ہے نہ اونچے محل جو بیاں میں یلکھ مرنے سے گزر کرتے ہیں۔ تبھی تو ان لوگوں نے انڈیا و جی بم بنایا۔ ہم زیادہ سے زیادہ تانگے کا بم بنا سکتے ہیں۔

یہ ملک برطانیہ غلطی — ہمارا پرانا آقا جس کے قدموں تلے کبھی دھرتی دہتی تھی، آج کا امن مارکیٹ کی ممبری کے لئے عرضیاں دیتا پھر تک ہے اور فرانس جیسے ملک اُسے دُعا بتاتے ہیں لندن کے چہرے کا فروغ اگر قائم ہے تو فورسٹوں کے بل پر۔ یہاں کے بڑے بڑے اسٹوروں کے

خریداریاں کے مقامی لوگ نہیں بلکہ سروس فریڈ باہر سے آئے ہوئے لوگ ہیں۔ خود ہم نے ایک دکان سے آٹھ دس ٹائیاں خریدی ہیں۔ ایک جگہ سے سوٹ خرید کر برطانیہ کی معیشت کو تھوڑا استحکام بخلا ہے۔ اور اس ملک کی مزید مدد کے لئے کل ایک ساٹھ کئی جوڑے جرابوں کے اور ایک جوٹا خریدنے کا ارادہ ہے کیا کریں اس ملک سے ہماری پرانی سیاسی اور ثقافتی یادداشت ہے۔ مصیبت کے وقت ہم اس کے کام نہ آئیں گے تو اور کون آئے گا؟



بیان لذت آوارگی کا

لندن میں آج کل ہتی وٹوں HIPPIES نے زور باندھ رکھا ہے یوں تو یہ خدائی
 خوار کھاں نہیں ہیں لیکن لندن ان کو زیادہ مرغوب معلوم ہوتا ہے۔ یہاں پکا ڈلی سرکس اور رزیا لگر
 سکویران کے خاص ٹھکانے ہیں۔ اتوار کی شام ہائیڈ پارک پر بھی پورس کرتے ہیں۔ بال اُبھے
 کپڑے چلیٹ۔ واڑھیاں پریشانی۔ پاؤں رکھتے ہیں کہیں اور کہیں پڑتا ہے۔ زیادہ تر جوئے۔
 ایک لڑکا اور ایک لڑکی لگوں میں گھنٹیاں۔ اتھوں میں پھول۔ گل ہاتے محبت۔ مانگتے ہوئے،
 کھاتے ہوئے۔ جہاں جی چاہا پھسکڑا مار کر بیٹھے گئے یا بیٹ گئے۔ بجھے ہرے سگرٹوں کے ٹکڑے
 اٹھا کر پیئے گئے۔ کسی نے پھولدار چھینٹ کا فرغل پہن رکھا ہے۔ کسی نے روٹی کی بندھی گئی
 میں نانا بھی ہے اور آنکھوں میں مٹی بھی۔ شراب کی سی نہیں پھانڈو کی سی۔ بہت سے غدرستی بھی
 رکھتے ہوں گے۔ تو جہ طبعی کے لئے جیسے بنارکھا ہوگا۔ لیکن زیادہ ترک دار سنگی اصل معلوم
 ہوتی ہے۔ آپ ایسے ذہنی روگ کر بیجئے۔ لوگ انھیں دیکھتے ہیں اور فرے لیتے ہیں۔ نوجوان
 لڑکے اور لڑکیاں ان کی طرف کھینچتی بھی ہیں۔ بعضے ان پر نفیر کرتے ہیں۔ بعضے ہمدردی جاتے
 ہیں۔ اچھے اچھے گھروں کی لڑکیاں ماری ماری پھر رہی ہیں۔ بعضوں کے نزدیک یہ اس معاشرے

کار تو مل ہے جو اس درجہ سرشتہٴ خمارِ روم و قیود تھا کہ باب گھر کے اندر بھی شام کو کھانے پر بیٹھا تھا تو باقاعدہ ڈزجیکٹ زیب تن کر کے۔ حمد و کثور یا کی اخلاق پرستی مشورہ ہے۔ ہم نے اس صدی کے آغاز کے لباسِ میوزیم میں دیکھے۔ عورتیں یہ بے بے لنگے پہنتی تھیں۔ لگے کے اوپر تک بٹن بند بہتے تھے اور پیراہن بھی خوب بھالدار ہوتے تھے۔ سورہ لباس قطع و برید کے بعد مٹی اسکرٹ تک پہنچا۔ یہی قطع و برید معیارِ اخلاق میں بھی ہوئی۔ پہلے رٹنے میں سر بازار چہا چاٹا کا ایسا دستور تھا۔ جیسا آج ہے۔ وہی لندن ہے جس میں آج ہستی لڑکے لڑکیاں اپنے کارڈوں پر یہ بیچ لگاتے پھر رہے ہیں۔

I AM FEELING SEXY

(..... لینا کر چلی ہیں)

I AM VIRGIN

(میں کنواری ہوں۔ یعنی آجیل بچے مار)

I AM FOR FREEDOM OF SEX

(اٹھائے جو بڑھا کر اٹھ)

I AM AN L.S.D. ADDICT

(میں نشے میں ہوں)

I AM A PSYCHIATRIST, -

LIE DOWN

(میں نفسیات کا ماہر ہوں، سیدھی لیٹ جاؤ)

یہ بیچ ڈیڑھ شلنگ میں ہر عجب لکھتے ہیں۔ پکا ڈال ہیں ڈالینا لگا سکواڑیں، ماربل اگرچ پر، ٹائٹم کوٹ ڈیڑھ گنڈے رہنا ان نماز خراؤں کا شیورہ ہے۔ بھٹنے لگے پاؤں رہتے ہیں۔ آنکھیں میل، دانت میلے اور سرتو جھاڑ بنا ہوا۔ مردوں کی دائریاں ایک سے ایک نرالی دھج کی۔ دائرہ می اب ولایت میں آباد لگی کے سامان میں شامل ہے جس طرح جہار سے مل کتے ہیں میاں دائرہ می دلے ہو کر یہ حرکیتیں کرتے ہوئے۔ میاں یہ کہا جاتا ہے: دائرہ می نڈے ہو کر یہ آوارہ پن ہنرم تر نہیں آتی ہ

جو لوگ ذرا پڑھنے خیال کے ہیں۔ دانتوں میں انگلیاں دبے کتے سانے دیتے ہیں کہ یہ کیسا زمانہ
 آن لگا ہے۔ کیوں اسی چور کیوں کے دینے پٹم جو رہے ہیں۔ ذیلی ٹیلی ٹرانز میں ڈھلس کیورڈن نے
 ایک مضمون لکھا ہے۔ روشنی کی حالت میں اس کا کنا ہے کہ جنسی جذبات کا اہل تو ہمیشہ ہر زمانے
 میں حوریت مرد میں انتشار ہے۔ لیکن لکھے زمانے میں بے ماہر وی کے مواقع کہ تھے۔ اب تو خود
 کمانے والی لڑکیاں آزاد ہیں۔ ان پر کوئی چاہے بھی تو کیسے پہرہ رکھ سکتا ہے۔ ہر آفت سے بچانے
 کے لئے ٹولی ہے۔ تحریریں کے لئے موٹر مائیکل ہے۔ اسپورٹس کار ہے۔ دولے فریڈ کے ساتھ
 ٹھہرے بلکہ ملک سے باہر جا کر چھٹی نسل کی آزادی ہے۔

گر ہو شراب و ساغر و محبوب خوبرو
 زامد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

ادھر نوجوانوں کے لئے بے شمار مواقع ہیں کسی بھی روشنی کو اپنی راہ پر لانے کے۔
 بس ذرا تکیس موبچیں ہوں۔ روپے پیسے کی بھی شرط نہیں۔ کیونکہ لڑکی خود لکاتی ہے۔ ادھر
 لڑکی کو روکنے والی کوئی چیز نہیں۔ دوسروں کو دیکھ دیکھ کر اس کی ذہنی کیفیت ایسی ہو جاتی ہے
 کہ اگر کوئی پایہ کرنے کے لئے اس کا غالب نہیں ہوتا تو وہ نکتہ بنتی ہے۔ خود کو ہم چشموں کی
 نظر میں حقیر محسوس کرتی ہے۔ جہاں سات سیلیاں مٹی ہیں اور اپنے معاشقے بیان کرتی ہوں وہاں
 اس کا احساس کمتری میں مبتلا ہونا قدرتی بات ہے ؟

کیورڈن صاحب نہ وعظ کرتے ہیں نہ قرب قیامت کی نوید دیتے ہیں ان کی دانی یہ ہے
 کہ یارو کچھ لڑکیاں تو ایسی ہوں گی جو اپنی عصمت بچانا چاہتی ہوں گی اور شرفیادہ شرطوں پر اپنی شادی کا
 انتظار کرنا چاہتی ہوں گی۔ پڑھنے نہانے میں ایسی لڑکیوں کو اس خیال سے تقویت دہتی تھی کہ معاشرے
 کا اخلاقی ضابطہ ان کی پشت پر ہے۔ ان کو بظہر تمہیں دیکھتا ہے۔ آج ایسی کوئی روک نہیں۔

معاشرہ انہیں سراہے گا تو کیا عجیب نظریے دیکھتا ہے کہ یہ کیسی لڑکی ہے۔
یہ اکثر نام لیتا ہے خدا کا، اس زمانے میں

Are we the last married generation?

نوشے آبزور نہی بھی ایک بپا چوڑا معنوں پھاپا ہے۔ کیا شادی کا رواج ہماری نسل کے ساتھ ختم ہو جائے گا؟ یعنی آئندہ لوگ راکریں گے میاں بیوی کی طرحت لیکن شادی کی کھکھڑیں اٹھائے بغیر! آبزور نہی نے دے دے دور کی دھندلی سی یہ تصویر دکھاتے ہوئے اس کی وجہ بیان کی ہے اس کا کہنا ہے کہ شادی کی جاتی تھی معاشرتی اور اقتصادی نقطہ کے لئے عورت شادی نہ کرتی تو لگاتی کہاں سے؟ شادی کے تصور کو کچھ تقویت نہ رہے سے ملتی تھی اور کچھ دانی ناپوں سے۔ اب لوگوں کی عمریں لمبی ہو گئی ہیں، ایک ساتھی کے ساتھ اتنی بڑی جنسی زندگی گزارنا دشوار ہے لڑکے لڑکیاں اب جو رغبت کو بھی جلد تر پہنچتی ہیں اور شادی سے پہلے جنسی تجربہ اب ایک قدرتی اور مستحکم بات گنی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بڑھ رہی ہے جو شادی کے بعد مکمل جنسی ناوازی کی توقع کرتے ہیں نہ لے اہم ہانتے ہیں، اب شادی عورت کا معاشی سہارا بھی نہیں۔ وہ خود جو کاؤ ہے۔ نئے داغین اسحاق (ایکس کفرٹ وغیرہ) کا کہنا ہے کہ ایک مرد یا عورت اپنے شریک زندگی کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے سے بھی مخلصانہ محبت کر سکتا ہے یا کر سکتی ہے۔ اس پر بے وفائی کی کوئی بات نہیں دونوں سے وفا ممکن ہے۔ ظاہر ہے ان داغین کے تصور عشق میں جنسی واردات بھی شامل ہیں۔

اس سلسلے میں آئندہ دو کے مضمون نگار نے بہت سے چوڑوں سے انٹرویو بھی لئے۔ ان میں ایک صاحب دیو ری اور تھ بھی ہیں۔ عمران کی چوبیس برس ہے اور ایک بچہ ہے پانچ سال کا۔ ایک دفتر میں سیکرٹری ہیں۔ شادی ان کی اب تک نہیں ہوئی۔ ان کا کہنا ہے کہ میں ۱۹ برس کی تھی جب ایسوارٹ پیدا ہوا۔ میں نے گھر سے بھاگ کر نوکری کر لی، اور اب ایک لڑکی کے ساتھ ایک فلیٹ میں رہتی ہوں۔ میں نے ایسوارٹ کے باپ سے شادی کرنے کا کبھی سوچا بھی نہیں۔ وہ اچھا شوہر بھی نہ ثابت ہوتا۔ کبھی بچہ پوچھتا ہے کہ اتنی میرا باپ کوئی کیوں نہیں؟ میں جواب دیتی ہوں اس لئے کہ اتنی نے شادی ہی نہیں کی۔ وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔ میرے بولے فریڈ ڈنر سے ڈنر بزم ٹھکانا رہتا ہے۔ ایک روز بس میں ایک عورت نے کہا — کتنا پیارا بچہ ہے بیٹے تمہارے ابو تو تم پر بڑا نماز کرتے ہوں گے۔ ایسوارٹ نے جھٹ لیا۔ میری امی کی شادی ہی کہاں ہوئی ہے؟ وہ بچہ باری حد سے بے ہوش ہوتے بچی۔

میں اور تھ کہتی ہیں کہ میں اپنی زندگی سے ناخوش نہیں۔ میرے مرد دوستوں کی طرف سے دوبارہ شادی کی پیشکش بھی ہو چکی ہے۔ میری دو سیلیاں جو جلدی میں شادی کر چکی ہیں۔ میری زندگی پر رشک کرتی ہیں۔

پس چاہیہ کہ وہ اسے اقوام شرق — مغرب میں تو محبت اور شادی دونوں کا دور نام ہوا جاتا ہے۔ امریکن پہلے اسکوائر میں درجنوں ایسے یونیورسٹی کے طالب علم چوڑوں کی تصویریں بھی ہیں جو بن بیاہے میان جوی کی طرح رہتے ہیں۔ اب ادب میں بھی گا زور دی کے سبب کے درخت کی ہیر و تیں نہیں ہے۔ وہاں میں گل گل کے مرنے جینا دونوں متروک ہوئے تھے کوچے ہر جانے جہیں دن سے رات کرنا۔ کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا۔ مغرب والوں

کے نزدیک یہ شر بے معنی ہے۔ آج کے شاعر کا چاند بالائے نام نہیں ہے اس کے پہلو میں ہے
 نہ مدد و چہاں نہ شکوے شکایت۔ نہ بے مہری جانان نہ سیاست و رہاں۔ چہتی لوگ ذرا زیادہ
 انتہا پسند نہ مظاہر و سہی لیکن سارے آدے کا یہی حال ہے۔

پہلی یورپ میں تو اب ایجاد ہوتے ہمارے ہاں صدیوں سے چلے آ رہے ہیں۔ ہم ناخن ان
 کا تماشا کرنے اتنی دُور آئے، پکا ڈلی سرکس میں اپنی شاہیں خراب کیں۔ یہ پریشاں گیسٹس بے چرخوں
 بھالدار وارٹھیوں۔ میلے کرتوں اور ہلے بالوں شکوں، کشکولوں، گٹھیوں، ناٹوسوں، تعویذوں
 دلے ہمارے ان کیا کم ہیں۔ اپنے وطن میں سب کچھ ہے پارے۔ کس پزیر لیگی ہے بولا مہری
 گی میں۔ جنگ گھنٹی ہے۔ چاند کا دم گٹا ہے۔ کوڑی سونے کے گھنگر و بجتے ہیں۔ سبزی
 کے جام تقسیم ہوتے ہیں۔ ہوتی، ہوتی لگے دم شے غم۔ شاعر نے ان پھندروں کا نقشہ یوں
 کھینچا ہے :

پھرتے ہیں یوں شہر کے اندر

اُگے کتے، پیچھے بندر،

دم مولا دم مست قلندر

ان میں بعض بے اولادوں کو اولاد بنشتے ہیں۔ مزد مستی رکھ کر ننگ دھڑلک پھرتے
 ہیں۔ پھولیں ہل کر قدم سے جاتے ہیں، بعض تو ہندیا میں ڈال کر روپے بھی دگنے کر دیتے
 ہیں۔ سرکاری ٹکسال یا اسٹیٹ بینک جانے کی حاجت ہی نہیں۔

ہر فرد اور ہر زمانے کا ایک فلسفہ ہوتا ہے۔ جب تک انسان پتھر پر پتھر مار کر آگ جلاتا

تھا اور سوچے ہرن یا بیل کو آگ پر جھونتا تھا۔ یہ ایٹم بم، کمپیوٹر اور غیر ملکی زرببادلہ کے ٹٹٹے نہیں تھے۔ تب تک ہر جگہ امن اور شانتی تھی، لوگ مراقبوں میں جاتے۔ پیسا کرتے اور اپنی ذات کو رفعت بخش کر بڑے اطمینان سے اپنی اپنی قبر میں چلے جاتے۔ پھر بقول استاد ذوق: خط بڑھا، زلفیں بڑھیں، کاکلی بڑھے، گیسو بڑھے یعنی آبادی بڑھی، حرم بڑھی، جوع الادھ بڑھی۔ لوگوں نے علم سے کار اجیسی لینا شروع کیا۔ اور بات تیر و تبر سے ہوتے ہوتے مائتد و جن بم اور مڑاٹوں تک پہنچی۔ پیسا اور اعکاف کے زمانے گئے۔ اب کسی آدمی کی ذاتی نیکی اور تقشف بے معنی چیزیں ہیں۔

موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

ایک یورپین ایک روز جلدی روحانیت کی تعریف کر رہا تھا۔ ہم نے کہا: اے جیسا ہمارے ساتھ سوداھے کرے۔ یہ روحانیت تو بے لے۔ ہم تجھے اپنے صوفی بھی بخشے ہیں تصوف کی دولت بھی تیری نذر ہے۔ ہمارے ہاں شاعر بھی بڑا بڑا پڑا ہے۔ وہ بھی سپردم بتو یاہ خوش را۔ یہ سب بے لے تو اپنی روج کی پاکیزگی کا اتہام کر۔ اتنے میں ہم تیرے ٹریکٹر تیری ملیں۔ تیری حرفت۔ تیرے ٹیکنیکل کالج اور تیرا زرببادلہ استعمال کرتے ہیں۔

ہمارا سنہ مشرق و مغرب کو حتی الوسع ہم سچ کرنے کے لئے یہی ہے کہ ہم اپنا تصوف مع قوالوں کے اور اپنی شاعری مع اس کے سوز و گداز کے کمپیوٹ کریں اور سائنس اور ٹکنولوجی درآمد کریں۔ کچھ ان لوگوں کی رفتار سست ہو کچھ جلدی تیز ہو جب برابر آجائیں گے تو سوچیں گے کہ اب کیا کرنا ہے۔ حضرت خلیفہ جالندھری نے فرمایا ہے۔

اں سے غیر کو بھی درو کی دولت یا رب
ایک میرا ہی صلا ہو بے منظور نہیں،

نغاتِ عاشقاں سے گھمکول شریف تک

جانے لوگ ان عیوں کو چوں کے نام گارڈن بلکہ گارڈنز کیوں رکھتے ہیں جہاں ایک پتی بننے کی نہیں ہوتی۔ کونٹز گارڈن کے سامنے تو خیر یاغیچ ہے۔ خاصا بڑا ہے۔ ہمارے گھر کے لان سے بھی بڑا، لیکن پورچسٹر گارڈن وغیرہ نام تو لوگوں کو سبزبان دکھانے کو رکھے گئے ہیں۔ ایک اور بات یہ کہ ہمارے ان پارک چوٹی سی چیز ہوتی ہے، جیسے اوٹنگ زیب پارک۔ اساسنک پارک وغیرہ۔ لیکن گارڈن بڑا ہوتا ہے۔ ہرنس گارڈن، لارنس گارڈن وغیرہ یہاں اس کے آٹ ہے۔ یہاں پارک بڑے ہوتے ہیں۔ مثلاً ایٹڈ پارک۔ ریجنٹ پارک وغیرہ۔ جانے کیوں یہ الٹی لنگا بنائی گئی ہے۔ پھر یہاں کے پتے پریشان کرتے ہیں۔ ایک نام سے لیجئے مثلاً یسنٹر۔ ایک تو یسنٹر روڈ ہوگی۔ پھر اس میں یسنٹر گارڈن ہوگا۔ یسنٹر اسٹریٹ ہوگی۔

یسنٹر پیس ہوگا۔ یسنٹر سکوائر ہوگا۔ یسنٹر یارڈ۔ یسنٹر وے۔ یسنٹر گورڈ۔ یسنٹر میوزیم بھی وہی جو پرانے زمانے کے اصطلاحوں کی کڑیاں بنائی گئی ہیں۔ اور اس پر گفتا نہیں اس میں کوئی جھلا مانس اپنے مکان کا نام یسنٹر بلڈنگز رکھے گا۔ یسنٹر کیفے۔ یسنٹر لاج۔ یسنٹر آؤس وغیرہ۔ جہیں ایک جگہ واروک گارڈنز کا پتہ دیا گیا تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ہر طرف واروک ہی واروک ہے

کوئی ایجنیہ ہے تو کوئی یاڈ ہے، کوئی اسکویر ہے، تو کوئی گارڈن ہے۔ جو کئے یا رے کچے
 تو سوئے وار چلے۔ قیامت یہ ہونی کو داروگ گارڈنزدو ہیں۔ ایک لندن ۲۷ میں بھی جا کے
 قرب، ایک لندن ۱۶ میں خاصی دور۔ آخر تک مار کر جم واپس آگئے۔ پیرس میں بھی
 یونیورسٹی وار۔ چلیس وغیرہ کے چکر بہت ہیں۔ اور ہمارے ان بھی روڈ، اسٹریٹ، بازار
 کو چر۔ گلی وغیرہ کا سلسلہ ہے لیکن انگریزوں کا مقابلہ نہیں۔ خدا جانے یہ لوگ اپنے گھر
 کیسے توش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر اسٹیشن کے کمال پر ایک کتاب ہے۔ ہے 'نغات عاشقان'

THE LOVER DICTIONARY

بعد میں یہی کتاب زبان کے مشور اور ایک دوسرے کے مطابق دنیا کے سب سے بڑے

کتب فروش فوکل کے ان بھی پائی۔ یہ ایک ہدایت نامہ ہے۔ درغلاہٹ SEDUCTION
 کے لئے ہر وقت پر جا بجا ہونٹوں کے بوسوں کے عجوبی نقوش ہیں اور اندر گفتگو کی صورت میں ٹوٹکے
 دیئے گئے ہیں، پانچ مختلف زبانوں میں۔ اس کتاب کی مدد سے انگریزی، فرینچ، جرمن، آلمین اور
 ہسپانوی زبان میں کسی اجنبی لڑکی سے اظہار عشق کیا جاسکتا ہے۔ اس کا جواب حسب مراد ملے یا
 پہل سے فرمت ہوتی ہے۔ اس کی ذمہ داری مصنف قبول نہیں کرتا۔ نمونہ کلام :

۔۔ جہاز میں سفر کرتے ہوئے :

"ارے میں کہاں آئی۔ مجھے سوتے میں چلنے کا مرض ہے :

"میرے کہن سے سمندر کا نظارہ زیادہ اچھا ہو سکتا ہے۔

ہوائی جہاز میں :-

”میں ذرا آپ کا ہاتھ پکڑ لوں۔ جب جہاز اڑے گا۔ تو میں گھبرا جاتا ہوں۔“
 ”یہ سیٹوں کے درمیان کا ڈنڈا نکال لیں تو زیادہ آرام رہے گا۔“

گاڑی میں :-

”جی بھادوں؟ میری آنکھوں کو روشنی سے تکلیف ہوتی ہے۔“
 ”معاف کیجئے۔ یہ پانچ پونڈ کا نوٹ آپ کا معلوم ہوتا ہے۔“

ساحل پر :-

”اسے میں سمجھا آپ بے ہوش ہو گئی ہیں۔ اس لئے مصنوعی تنفس دے رہا تھا۔“
 ”میں آپ کے تیراکی کے سوٹ میں سے ریت نکال دوں؟“
 ”میں تو یہ پکڑ کر اڑ کر تا ہوں آپ کپڑے بدل لیں.....“

سینا میں :-

”سب سے پچھلی سیٹ پر بیٹھیں۔ راں سے اچھا نظر آتا ہے۔“
 ”اوہ میں سمجھا یہ میری کرسی کا ہتھکا ہے۔“
 ”میرا دستاں آپ کی ٹانگوں کے آس پاس گر گیا تھا۔“

اپنے فلیٹ میں :

”میں بتانا بھولی گیا تھا کہ میرے والدین کا ایک گاڑی ملے گئے ہیں“

”پتہ نہیں باب کا فیوز کیسے اڑ گیا ؟“

”یہ کمرے کا تالا کیوں جام ہو گیا“

اُس کے فلیٹ میں :

”تھک گیا ہوں۔ ذرا میٹ جاؤں۔ آپ بھی یہاں آرام کر لیجئے“

(اُس کا میاں آہلئے تو)

”میں بھی رالا ہوں۔ میٹر دیکھنے آیا تھا“

ہوٹل میں :

(لفظاً کوئی بھی فرش نہیں ملین کوئی فقرہ نقل نہیں کیا جاسکتا)

اس کی والدہ سے :

”میں نہیں مانتا آپ اس کی والدہ ہیں۔ اُس کی بہن ہوں گی آپ ...“

”چھپا چھڑانا ہو تو“ سمات کیجئے ہیں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ میری بیوی اس پر

رخصتہ نہ ہوگی“

کچھ مفید مطلب کلمات

”تم اتنی خوبصورت ہو کہ میں تنہائی میں اپنے پر اعتبار نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ اے میری زندگی کی
 رخشہ! اے ملکہ! چہرے والی۔۔۔۔۔ تمہارا حسن پاگل کر دینے والا ہے۔“ تم دوسری عورتوں
 سے الگ ہو۔۔۔۔۔ دوسروں کے جھگڑے میں نہیں پڑا کرتے۔“

۳

مذاقہ کنسلٹنگ میں پرانی کتابوں کی ایک دکان پر ایک صدی پہلے کا ایک پرچہ نظر آیا۔
 (دیکھیے دیکھا جاتا ہے) TEASING MADE EASY

عورتوں کے لئے نصیحت نامہ:

تصویروں دکھاؤ تو نوں کے نیچے عبارت ہے:-

”عورت کو چاہیے کہ ایک دن بے سہارے تیار رہے۔ دوسرے دن چہرے پر تیرہری
 چڑھائے اور اپنے کو دھوکہ کھینے۔ بے رخی سے جواب دے لیکن اس بیج میں ایک انوکھی بھری
 بھی ڈالے۔ رخصت کے وقت کہے، خدائے عالم۔ اگلی صبح وہ ضرور آئے گا۔ اس
 وقت شوے بنائے۔ اس کی باتوں میں خود کو ڈال دے۔ وہ خود اپنے ناکہ رہ گناہ پر نادم ہو گا،
 اور معافی چاہے گا۔ اس وقت معافی دے دینی چاہیے۔۔۔ وغیرہ“

۴

انگریزی اخبار کے اشتہارات کے کالم میں سے:

”سینکڑوں برطانوی اور غیر ملکی لڑکیاں دوستوں کی تلاش میں ہیں۔ پتہ ذیل پر خط لکھئے:-

گولڈن - ۵۲، ریز کورٹ روڈ - لندن

TEASING MADE EASY.

ADVICE TO LADIES.

HOW TO TEASE THE GENTLEMEN.

HOW TO GET A LOVER.

And a mass of Information on

LOVE, COURTSHIP, & MATRIMONY.



• روانس لڑائیے پاشادی کیجئے۔ رشیکوں سے جانا ہمارا ذمہ۔ ہر عمر کی ہیں اور خوبصورت
پتہ : افلا ۳۰ بیکرا سٹریٹ۔ لندن

ہمارے کلب کی خواتین ارکان کے لئے مردوں کی عزت ہے۔
پتہ : ۷۴۔ امرسٹ پارک۔ لندن

• آپ امید سے تو نہیں ہوئیں؟ ہم سے معائنہ کرائیے۔ فیس دو پونڈ۔ معامت میٹر راز
میں رہے گی :- پتہ : بل چکٹر ۴۔ چارلٹ روڈ۔ لندن

۲۵ سال کے ایک نوجوان کو حجت چاہیے۔ ۲۵ سے ۴۴ سال تک کی کنواری ہو۔ بیوہ ہو
 حلاق یافتہ ہو۔ کچھ پروانیں۔ مقصود دوستی ہے۔
 کس نمبر ۲۵۱

برطانوی کنولرا عمر چالیس سال۔ کسی ہندوستانی۔ ایشیائی، ایفر و ایشیائی لڑکی سے دوستی
 چاہتا ہے۔ عمر ۳۵ تا ۴۵ سال قابل قبول ہے۔

ایک خانقاہ کا تربیت یافتہ پادری عمر ۲۹ سال۔ اعلیٰ ڈگری یافتہ۔ شرملا۔ ایسی عورت سے
 بحث پٹ یاد چاہتا ہے جو راز کو راز رکھے۔

اور دوسرے سرے پر :

لندن کے ایک اردو اخبار میں اطلاع عام :
 کاونٹری (انگلستان) گھمکول شریف کو باٹ کی خانقاہ نقشبندی کے سالانہ عرس کے
 موقع پر ۱۸ اکتوبر کو صبح دس بجے جامع مسجد کاونٹری واقع اگل اسٹریٹ میں ایک روحانی
 تقریب سنائی جائے گی۔ جس میں نعت غزل اور علقے کلام شرکت کریں گے۔
 سجادہ نشین آف موہڑہ شریف بھی عوام سے خطاب کریں گے۔ عاتقہ کے مسلمانوں سے
 شرکت کی درخواست ہے۔

ہائے بشیرا، ہائے بشیرا

ہمارے دوست سید سبط حسن آج کل لندن میں ہیں۔ بابل نینوا اور بعلبک وغیرہ کے خرابوں کی خاک چھانتے یہاں پہنچے ہیں، معلوم ہوا کہ ٹیلی ویژن کے اشاری پر دو گراموں کی تکنیک کا مطالعہ کر رہے ہیں، ہم سے ملاقات ہوتی تو ہم نے پوچھا کیسے گزرتی ہے۔ بولے، 'بشیرا یاد آ رہا ہے، ہم نے کہا، یہ کون بزرگ ہیں؟ بولے، 'اے بھائی اپنا بشیرا جو ہمارا حقہ بھرتا ہے، ہمارا بستر لگا تا ہے، ہمارا جوتا پاش کرتا ہے، علی الصبح چائے بنا کر دیتا ہے، ہمارے مہانوں کے لیے پانی سرسٹلاتا ہے، دھوبی کے ہاں کپڑے دے کر آتا ہے، اور پھر لاتا ہے، گھر کے لیے سبزی کوشت آنا دال سبھی کا ذمہ دار ہے۔ ہمارے گھر میں اصل چیز تو وہی ہے، ہم تو فاضل ہیں۔ ہمارے بغیر ہمارے گھر کا گزارا بخوبی چل سکتا ہے۔ بشیرا کے بغیر نہیں!

تب معلوم ہوا کہ اپنے ایک دوست کے ان مقیم ہیں اور اخلاقیات ہر روز صبح کو پورے گھر کے برتن دھوتے مانجھتے ہیں۔ یہ ان کا خاندانی پیشہ کبھی نہیں رہا۔ لہذا ہاتھوں میں گٹھے پڑ گئے ہیں ان پر تیل لگاتے ہیں اور اتھو سکتے ہیں چونکہ ان کے

دوست ہسپتال چلے گئے ہیں لہذا انھوں نے فرایا تمہارے پاس جگہ ہو تو ہم بھی آجائیں۔ ہم نے کہا بسم اللہ۔

سید سبط حسن کے ہمارے مکان میں آجانے سے پہلے ہمیں دھوہنی نانی کی بڑی دقت تھی، اب نہیں رہی عین نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنے کام کے آدمی ہیں۔ ہم نے اپنے رومال اور ایک دو بنیائے دھونے کو نکالے تو بولے، کیوں اتنی زحمت کرتے ہو، میرے تھیلے میں ڈال دو، میں تھوڑی دیر میں گھاٹ پر چلنے والا ہوں، ہم نے کہا، گھاٹ؟ آپ جا کر یہ کپڑے دھوئیں گے؟ چھو اچھو کریں گے؟ انھوں نے کہا اُس سے آپ کو کیا مطلب۔ آپ اپنے کپڑے اس تھیلے میں رکھیے اور میں یہ لادی لیے جاتا ہوں۔ دوپہر تک آپ کو دھلے دھلائے کپڑے مل جائیں گے۔ تب معلوم ہوا کہ وہ پڑوس میں ایک لائڈریٹ دیکھ گئے ہیں، یہ ایک دوکان ہوتی ہے جس میں کپڑے دھونے کی مشینیں قطار در قطار رکھی ہوتی ہیں آپ خود ہی مشین میں کپڑے ڈالیے۔ صابن ڈالیے اور ایک سوراخ میں سکے ڈالیے۔ مشین ایک مینڈل گھمانے سے چلنے لگے گی۔ وہاں سے نکال کے دوسری مشین میں رکھیے اور ایک گتھی ڈالیے، وہ ان کو پوری طرح نچوڑ دے گی۔ تیسری میں ڈالیے تو چھپس میں سکھا دے گی۔ افسوس ابھی تک ایسی مشینیں نہیں نکلیں کہ چھپس کا سکہ لے کر کپڑے استری بھی کر دیں۔ لیکن اس کے لیے سید صاحب ایک جلیبی استری لے گئے ہیں جب ذرا گردن جھکائی کپڑا استری کر لیا۔

کچھ دن سے ہمارے بال بڑھ رہے تھے سید صاحب نے کہا، تم نہ ہتی ہو نہ انگلی پھول ہو کو تمہارے بال کاٹ دوں چلا ہو میں شاکر علی ہمارے بال کاٹ دیا

کرتے تھے ہم اُن کے۔ ہم نے کہا شاکر علی صاحب کی اور بات ہے۔ اُن کے سر پر بال ہی کتنے ہیں۔ مجھے صاف رکھئے، کسی نائی کا پتہ بتا دیجئے۔ تب انھوں نے ہماری رہنمائی کی پیش کش کی۔ ایک نائی کے اُن سے گئے، جہیں اُس کی کرسی پر بٹھا یا اور خود اختیار پڑھنے لگے، لیکن ابھی سرخی آدمی ہی پڑھی ہوئی کہ نائی نے کہا: 'بس جناب ہوگئی حجامت! اب لائے چھ شنگ دیجئے۔' اُن صاحب! اب کس کی باری ہے؟ آئیے۔

ہماری حجامت ہونے میں محاورے کے لحاظ سے بھی اور دیے بھی دو منٹ سے زیادہ نہ گئے ہوں گے۔ اس بندہ خدا نے ایک کنگھا اٹھایا اور ایک بجلی کی مشین۔ شمع تک تو ہم نے بھی دیکھا کہ پروانہ گیا، پھر کچھ معلوم نہ ہوا، یہ بات ہمیں کچھ پسند نہ آئی کیونکہ آٹھ شنگ جمع دو شنگ بخشش سے قطع نظر جو ہمیں طے عا کر آدینی پڑی اور جسے لے کر اس شخص نے سلام تک نہ کیا، ہمیں یہ سب کچھ حجام کی دوکان کی روایت کے خلاف لگا۔ ہم نے الف میلہ میں بوبک حجام اور اس کے بھائیوں کے قصے پڑھ رکھے ہیں۔ ان کی نسل تو اب ناپید ہوئی تاہم کراچی میں جن خلیفہ کے آگے ہم سر جھکاتے ہیں وہ بھی کم از کم ہم سے عرب اسرائیل کے مسئلے، آٹے وال کے بھاؤ، نئی نسل کی بے راہ روی اور مذہب سے دوری اور روس اور امریکہ کے گٹھ جوڑ پر فرد گشتگو کرتے ہیں۔ پیچھے کے بال مشین سے اور آگے کے قینچی سے کاٹتے ہیں۔ سترے سے قلیں بناتے ہیں۔ پھر آگے پیچھے سے شیشہ دکھاتے ہیں، بالوں کی چھپی کرتے ہیں۔ کنگھا کرتے ہیں ان کا ریٹ تو ایک دہریہ ہے لوگ چار آنے ٹپ بھی دے دیتے ہوں گے لیکن سیر حشی ہماری طبیعت میں داخل ہے اس لیے ہم بال کن کراچی جب سے حاتم کی قبر نکال کر پہلے اسے شوکر راستے ہیں پھر اسے ڈیڑھ دہریہ دیتے ہیں۔

وہ خوش ہو جاتے ہیں اور دوسرے ہو کر سلام کرتے ہیں۔ اس لندن کے نائی نے تو ہمارے بال تک نہیں جھاڑے۔ ایک تو یہ ہماری طرف پھینکا کہ جھاڑ لیجئے۔

سید بسطاحی کو سوادِ دمتہ الکبریٰ میں جو دتی یا دانی یعنی لندن میں بشری کی تقدیر معلوم ہوئی تو اس کی وجہ یہی ہے کہ یورپ میں بشری قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ دفتر ہو یا گھر۔ آپ خود ہی اپنے چراسی۔ خود ہی اپنے چوکیدار، آبدار، خاصدار، خانہ سالار وغیرہ۔ اور گھر کی بی بی خود ہی اپنی آیا۔ چھوچک، منگانی، اتا، میراسی، دھوبی اور زمانہ ہوتی ہے۔ انسر خود ہی فاقی پر جو کچھ لکھتا ہے لکھ کر دوسرے کمرے میں دوسرے اہل کار کو دینے جاتا ہے پھر والا اور گھر والی دونوں اپنا سودا خود لاتے ہیں خود پکاتے ہیں اور خود ہی برتن مانجھتے ہیں 'جھاڑ دے کر گھر کی صفائی کرتے ہیں۔ اس بڑے عظیم میں انگریز آتا تھا تو بیاں کی گرمی کے باوجود اگر واپس نہ جاتا تھا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ اس کے اشارے پر دس آدمی بکوس باندھے خدمت کر جھگے آتے تھے۔

سید صاحب کو ہم نے اپنا جوتا آپ پالش کرتے اپنے پاپ کی حلیم آپ بھرتے اور اپنی قمیض کا بٹن آپ ٹانگتے اور اپنی پتلون پر استری کرتے دیکھا تو ہم نے ان سے باتِ عامہ معافی چاہی کہ ہم تو آپ کو بائبل ناکارہ آدمی سمجھتے تھے۔ آپ تو خالص سکھڑ نکلے معلوم ہوا پکانا ریند صاحبی جانتے ہیں۔ کم از کم انڈے کی لیتے ہیں اور تو سی سینک لیتے ہیں۔ گھر کے کام کاج سے بخوبی واقف ہیں اگر ان کی شادی نہ ہو چکی ہوتی تو ہم ان کے لیے کسی تعلیم یافتہ ہر سر روزگار لڑکی کا برقعہ کش کرتے۔

سید صاحب کو سب سے زیادہ تکلیف صبح کی چائے یعنی بیڈ ٹی کی ہے۔ وہ صبح صبح اٹھ جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ سحر خیزی کی عادت کبھی ہماری بکھر میں نہیں آئی۔ چرنڈ پرند کی بات اور ہے ان کے تو بستر نہیں ہوتے اور پھر ان کو اٹھ کر چوگا بھی تلاش کرنا ہوتا ہے۔ انسان تو اثرات الغنومات ہے بستر رکھتا ہے۔ خیر تو سید صاحب اٹھتے ہی ٹائے بشیرا کافرہ لگاتے ہیں اور کہتے ہیں مجھے دنیا میں اور کچھ نہیں بشیرا چاہیئے۔ ان سے پہلے مرزا سودا بھی اپنے قیدے میں حرص نامی شخصے سے کہہ چکے ہیں کہ دنیا کی ساری چیزیں تجھے مبارک ہیں اور ساتھ میرے میرا بسنت خاں ہو۔ اب وہ جلد ہی کراچی لوٹنے والے ہیں اور میں ان پر رشک آ رہا ہے۔ یہ نظم بشیرا نامہ ہم نے انھی کے لیے لکھی ہے۔ انھی کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔

بشیرا نامہ

ہم نے کل جب دل کو چھرا	صبر کا پایا ختم ذخیرہ
جیب میں بھی اب پونڈ ڈلیرو	ہائے بشیرا، ہائے بشیرا
جب ہم دس کانوٹ دکھائیں	تب اک گوشت کا ٹکڑا پائیں
وہ بھی اونٹ کے منہ میں ڈیرہ	ہائے بشیرا، ہائے بشیرا
ساڑھے چھ میں اک خر بوزہ	اٹھ روپے میں آدھا چوزہ
ڈیڑھ روپے کا چھوٹا کھیرا	ہائے بشیرا، ہائے بشیرا
ہوٹل وٹل ٹیکسیاں کاریں	سبھی جلدی کمال آبادیں
جان کے آغا خاں کا بغیرہ	ہائے بشیرا، ہائے بشیرا

سات روپے میں بال کٹا کر	گھاٹ پہ خود لا دی ہے جا کر
روئے بیٹھ کے بھگت کبیرا	اٹے بشیرا، اٹے بشیرا
کون ہمارا شو چھکائے	صبح سویرے چائے لائے
دل اپنا بے حد د لگیرا	اٹے بشیرا، اٹے بشیرا
تن میں اپنے جان نہیں ہے	منہ میں اپنے پان نہیں ہے
کیسا زورہ؟ کون خمیر؟	اٹے بشیرا، اٹے بشیرا
جان بچے تو لاکھوں پاتیں	خیر سے اب ہم گھر کو جاتیں
دیکھو لیاورپ کا دھیرہ	اٹے بشیرا، اٹے بشیرا

لندن میں ہم رہے تو بہت دن لیکن ان میں سے آدھے سوٹ کیس کو چابی ٹھونے اور آدھے جوتا ٹھونے میں گزر گئے۔ چابی کا قصہ یہ ہے کہ مید بسط حسن کے ایک دوست اپنا سوٹ کیس جس میں ان کے پڑنے میلے کپڑے بھرے تھے لندن چھوڑ گئے تھے اور سید صاحب سے کہہ گئے تھے کہ اسے بُک کر کے بیٹے آنا۔ دیکھا تو اس کی چابی نہیں تھی اور تالا بند نہ ہو تو ایتر کھینچنے والے سامان قبول نہیں کرتے۔ آخر انھوں نے سوٹ کیس ہاتھ میں اٹھایا اور چابی بنوانے کے لیے نکلے۔ بازار دو تین فرلانگ کے خاصے پر تھا کبھی اس ہاتھ میں لیتے۔ وہ تھک جاتا تو دوسرے ہاتھ میں۔ ہمارے ایک ہاتھ میں ایک کتاب تھی اور دوسرے ہاتھ میں اس روز کا اخبار تھا۔ ورنہ ہم ضرور ان کا بوجھ بٹاتے۔ کوئٹہ سے پراس ہوسے سے دوسرے ہوسے تک گھوم گئے۔ چلنے یہ لندن والے

کیسے لوگ ہیں۔ جوتے، پمپڑے، بسکٹوں، مٹھایتوں، بھلی کے سامان، سگریٹوں اور لاپلا چیزوں کی دوکانیں تو بہت ہیں لیکن جو سب سے ضروری چیز ہے یعنی تالوں کی کٹڈ چابیاں بنانا۔ بس وہی نہیں ہے۔ ایک جگہ پوچھا تو دوکاندار نے بغیر ہماری طرف دیکھے ایک طرف کو ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا۔ ادھر چلے جائیے **AROUND THE CORNER** ہے۔ ہم اگلے موڑ پر گئے۔ وہاں کوئی نشان نہ ملا۔ ایک سگریٹ فروش سے پوچھا۔ اس نے کسی اور طرف اشارہ کیا۔ اور کہا **AROUND THE CORNER** آخر ایک بڑے اسٹور میں گئے وہاں معلوم ہوا کہ **KEY CUTTER** یعنی چابی بنانے والا ہے۔ اس نے سوٹ کیس کو دیکھتے ہی سر ہلا دیا کہ جناب ایسی چابی نہیں بن سکتی۔ وہاں سے ہم انڈر گرؤنڈریل کے سٹیشن پر پہنچے اور آکسفورڈ سٹریٹ پر اتارے۔ وہاں **WOOLWORTH** کے ہاں دینا بھر کی چیزیں اور دینا بھر کے کام ہوتے ہیں۔ وہاں ایک مثال پر لکھا تھا کہ یہاں تالے کی چابیاں بنائی جاتی ہیں اور جوتوں کی ایڑیاں لگائی جاتی ہیں۔ ہم نے کہا :-

”حضرت اس کی چابی بنا دیجئے“

اس نے کہا :- ”جی مجھ سے نہیں بنے گی اس کی چابی۔ میں تو مکانوں کے دروازوں کی چابیاں بناتا ہوں۔“

ہم نے کہا :- ”اچھا تو ہمارے جوتے کی ایڑی گھس گئی ہے یہ لگا دیجئے۔“
ہم نے سوچا بجا تھے چور کی فلکڑی ہی سہی لیکن اس نے اس کے لئے بھی معذرت کر دی اور کہا کہ ایڑی تو کسی درکشاپ ہی میں لگ سکتی ہے۔ کسی جوتے والے کے ہاں جاتیے۔



اب چابی کی طرف سے یا تو کس ہو کر ہم نے جوتے دانوں کی دکانوں کے چکر کاٹنے شروع کئے۔ خدا خدا کر کے ایک سوچی نے ہامی بھری کدوں بن جاتے لی ایڑی لیکن تھکا بھی گھس گیا ہے۔

”وہ بھی لگا دیجئے اور کل دسے دیجئے کیونکہ ہم پر سوں جا رہے ہیں“

”لگ جلتے گا۔“

”ہر یہ کیا ہو گا؟“

ہوئے۔ پچیس شنگ کی رہ پنس؟ (پاکستان دے بس اتنے ہی روپے بھجیں) ہم نے جوتے کو گھما کر مین اس کی دکان اور نظروں کے سامنے کوڑے کے ڈرم میں پھینک دیا اور تھیلے سے نکال کر دوسرا جوتا پہن لیا جو رستے سے خرید لائے تھے کیونکہ یہ جوتا جو ہم نے پھینکا کراچی سے ہم نے ٹھیک پچیس روپے لیا رہ آنے میں یا تھا۔

اب چابی کا مسئلہ بھی آخر حل ہوا۔ ہم نے کہا۔ ”ہمارے سوٹ کیس کا تالا بھی تو ایسا ہی ہے اور اس کی دو چابیاں ہمارے پاس ہیں۔ اسے لگا کر دیکھئے تو۔“

سید صاحب نے ڈرتے ڈرتے لگائی اور وہ کھٹ سے لگ گئی۔!

سید صاحب کو ہم نے گاڑی ملت کے علاوہ کو لمبے وقت کا خطاب بھی دیا ہے انہیں ہمارے محلے میں آنے دو بھی دن ہوتے ہیں لیکن اب انگریز ملک ان کے است

پوچھتے ہیں۔ یوٹب میٹن سے ہمارے گھر کا نہ حرکت ترین راستہ بھی انھی نے دریافت کیا وہ تو عظیم الفرصت ہیں دہنہ کے ٹوڈیخہ سر کرنے کا سہرا بھی انھی کے سر ہوتا۔ ابھی کل ہی بات ہے کہ بیک اسٹریٹ سے دائرہ جاتے ہوئے ہم تین بار قلعہ گاڑی میں سوار ہوئے اور انھوں نے تین بار جہیں زبردستی باہر نکالا۔ چند دن اور یورپ میں رہ گئے تو گائیڈ کا پیشہ اختیار کر لیں گے۔

جرمنی

۱۲، اکتوبر تا ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۷

اب ہم فریکفرٹ میں ہیں

انگریزوں کو دعویٰ تو انگریزی دانی کا ہے لیکن ڈسنگ سے بولنی نہیں آتی۔
 ہمارے پتلے بس ان کی اُدھی بات پڑتی ہے۔ کبھی وہ بھی نہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ
 قسمت ہی تھی جو ہمیں لفظ نزا کا جاز مل گیا۔ ہم لدے چند سے لندن ایئر پورٹ
 کی عمارت پر انتظار کرتے رہے کہ اب ٹائمک پڑتی ہے۔ اس دوران مائیکروفون پر
 کچھ لگنا ہٹ ضرور ہوئی لیکن ایسی کہ ہم نے اسے قابل اعتماد نہ جانا جب خاصی دیر
 ہو گئی تو ڈسک پر جا کر پوچھا کہ ”بی بی جی — یہ جرمن ایئر لائن لفظ نزا کا جاز نمبر
 ۲۲۳ جاتا کب ہے۔“

”کون سا جاز بے بی بی نے پوچھا“

”فریکفرٹ والا“

”بویس: ”وہ تو چھوڑ گیا۔ آپ کہاں تھے؟“

”ہم نے بتایا کہ“ کافی پی رہے تھے۔“

اب وہ بھاری بھائی۔ بویس۔ قاعدے سے تو چلے جانا چاہیے لیکن شاید۔

ایک برآمدے سے دوسرے میں دوسرے سے تیسرے میں مسافروں پر گرتے پڑتے۔ ایک سوڑمی، ایک سوڑمی کہتے کہتے ایک جگہ پہنچے جہاں مسافروں کو کوچ لے کر ہوائی جہاز تک جاتا ہے کیونکہ آخر لندن کا ٹریفک ہے جہاز اس عمارت سے کوئی پوری میل دور اترتا ہے۔ اُن لوگوں نے بھی کہا۔ آپ کی قسمت، کوشش کرتے ہیں۔ ایک شخص نے ہمیں اپنی جیب میں بٹھایا اور ہری لال روشینوں کی پروانہ کرتے ہوئے سرٹ بھاگا ہمارے دامن پہنچے تک میٹر بھی اٹھائی گئی تھی لیکن ہم نے کہا۔ ”ارے ظالمو! جرمز کیا کرتے ہو۔ پھر لگاؤ میٹر بھی۔ آخر ہم نے کرایہ دیا ہے۔ مفت تھوڑی جا رہے ہیں۔ اُن کو ہمیں سوار کرتے ہی بنی۔ ورنہ ہمارا سامان جو پہلے ہی بارہ موچکا تھا، فرینک فرٹ چلا گیا ہوتا اور ہم خالی لندن میں ٹپتے رہ جلتے۔

ایک ندی کے دو کنارے ٹپتے رہ جھوڑ

ہوٹل زیرِ پلن۔ سبحان اللہ کیا عمدہ ہوٹل ہے۔ یہ پہلا ہوٹل ہے جس کا غسل خانہ چھوٹا ہونے کی ہم شکایت نہیں کر سکتے کیونکہ اس کے ساتھ غسل خانہ ہی نہیں۔ ہم نے آتے ہی منیجر صاحب سے کہا۔ یہ کیا غیر معقولیت ہے، آپ ہمیں کمرہ دیں یا نہ دیں۔ ہمیں غسل خانہ ضرور چاہیے ہم نہانے دھونے ولے آدھی ہیں۔ بولا ”باب یہ بھی نعمت جانئے کہ آپ کا پیغام ڈیڑھ گھنٹے پہلے مل گیا تھا اس لیے کمرہ آپ کے لیے ہم نے ریزرو کر دیا ورنہ فرینک فرٹ کتاب میلے کارش ایسا ہے کہ کسی ہوٹل میں تل دھونے کو جگہ نہیں۔ آپ کے غور پر ایک مشترکہ غسل خانہ ضرور ہے لیکن وہ ایک سرکلی جوڑے نے ریزرو کر رکھا ہے۔ وہ دو دن بعد چلا جائے گا تو شوق سے دن بھر ٹپ میں بیٹھ

کر اسٹنان فرمائیے گا۔“

”ٹائلٹ تو ہے نا؟ یعنی آپ ہمارا مطلب سمجھتے ہیں۔“

”جی ہاں وہ ہے اور منہ اتھو دھونے کے لیے آپ کے کمرے میں وہ چیز بھی ہے

آپ سمجھتے ہیں نا؟“

”جی ہاں شکریہ!“

پیرس دے غفل غلنے کا احوال ہم کچھ چکے۔ لندن میں مسز واٹس کی سرائے میں جو گلوٹر ہوٹل کے بھاری بھر کم نام سے معروف ہے۔ ہم دوسرے لوگوں سے ڈیوڑھا کرایہ دیتے تھے۔ کیونکہ اس کے ایک کونے میں شاور بھی تھا یعنی اس قسم کا ڈبہ جس کے اندر آدمی کھڑا ہو سکتا ہے لیکن اتھو پاؤں نہیں بلا سکتا۔ سید سلطٰن حسن نے کہا ”میاں کیا کیا جائے۔ اوپر کا آدھا دھڑ تو نہایا ہوں۔ ٹائلٹوں پر صابن کیسے لگاؤں۔ اور پانی کا تریڑا بھی بس سر سے چھاتی تک آتا ہے۔

ہم نے کہا۔ یوں دو یا سیکھی ہے آپ نے؟“

بولے۔ ”اں کچھ کچھ تو پڑھا ہے۔“

”تو شیرشک اُسی سمجھیے۔“

”وہ کیا ہوتا ہے۔“ سید صاحب نے پوچھا۔

”سر کے بن کھڑے ہو جاتیے اور ٹائلٹیں اوپر کھڑی کر دیجئے۔ پنڈت نہرو سی کیا

کرتے تھے تبھی تو ان کو ہر چیز الٹی نظر آتی تھی۔“

”ان کا غفل خانہ بھی چھوٹا تھا کیا۔“

واحد علم۔ ویسے چھوٹا نہ ہوتا تو ان کو سر کے بل کھڑا ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ یا پھر اپنے زلزلے کے شاعر کو چہ رقیب میں اس شان سے جاتے تھے لیکن نہرو جی شاعر تو نہ تھے اگر پر شاعری کیا کرتے تھے۔

ہوٹل زمین میں بس یہ ایک تکلیف تو ہے اور تکلیف بھی کیا ہے۔ جھلا ہوا مری لگیا ٹوٹی پانی بھرنے سے چھوٹی۔ نہ نہانے کا معقول عند دل گیا۔ مسلمان یوں بھی جمعے کے جمعے نہاتا ہے اور لگے جمعے میں ابھی کئی روز ہیں۔ باقی ہر لحاظ سے یہ ہوٹل بہت آرام دہ ہے۔ مسز دانش کے ہاں ایک عینہ گزارنے کے بعد تو اور بھی زیادہ آرام و مہلوم ہونے لگا ہے۔ فرش پر تالین ہے۔ تولیے روز بدے جاتے ہیں۔ مسز دانش سے اس روز سید صاحب نے نیا تولیہ لگا تو بولیں ڈریج پنڈ روز میں تو نیا تولیہ ہٹنے سے نا ہمارا اس کمرے میں چار روشنیاں ہیں اور ہم چاروں رات بھر جلنے رکھتے ہیں کیونکہ لندن والے کمرے میں ہمیں اپنے پتے سے روشنی کرنی پڑتی تھی یعنی ہر دوسرے تیسرے دن میٹر کو رشوت دیتے تھے۔ اس کی جیب میں ایک شنگ ڈانا پڑتا تھا۔ ابھی اس روز ہم ایک خط لکھنے کو بیٹھے۔ ابھی خیریت موجود خیریت مطلوب تک پہنچے تھے اور غیب سے مضامین خیال میں آنے شروع ہوئے تھے کہ کھٹک سے بھلی بند۔ یہ شنگ والی بھلی انسانی زندگی کی طرح ہے۔ اس کا کچھ اعتبار نہیں۔ ہم نے سوچا ہاچس جلا کر اپنا کوٹ تلاش کریں کیونکہ معلوم نہیں کس کرسی کس صوفے یا پٹنگ پر پڑا ہے۔ کھونٹی پر ٹانگنے کے ہم قائل نہیں۔ پھر اس میں سے شنگ نکالیں لیکن روشنی ہوتی تو ہاچس ہمیں ملتی۔ خدا جانے کہاں دکھی ہو۔ پٹے ہاچس ڈھونڈنا اور اس کو شش میں دھڑا دھڑ

چیزیں گزرا۔ پھر کوٹ ڈھونڈنا اور پھر اس کی کئی جیبیں، ان میں سے شنگ ڈھونڈنا
 پھر میٹر ڈھونڈنا۔ اس کا سوراخ ڈھونڈنا بڑا طویل عمل تھا۔ ہم نے خط اور مضامین غیب
 کئے لیے دگلے روز کی تاریخ ڈال دی اور بستر پر دراز ہو گئے۔ رات کو چلنے کس وقت
 سید بھٹ حسن آئے ہوں گے۔ ماچس جلائی ہوگی۔ میٹر کا منہ شنگ سے بند کیا ہوگا۔ اور
 روشنی پانی ہوگی۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔

ہم جرمن زبان پر بھی حاوی ہو گئے

جرمن کے متعلق سنا تھا کہ شکل زبان ہے جن کے لئے شکل ہوگی، ہوگی، ہمیں تو اس کے سیکھنے میں چنداں وقت نہ پیش آئی، ممکن ہے اس کی وجہ ہماری طبعی ذہانت ہو۔ ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ہم گوتے اور شتر کی زبان کی باریکیوں پر تفقید کر سکتے ہیں یا جرمن زبان کی صرف و نحو پر کتاب لکھ سکتے ہیں، اتنا ضرور ہے کہ قول میں جا کر بے تکلفی سے کھانا مانگ سکتے ہیں اور راستہ بھی پوچھ سکتے ہیں۔ ہوا یہ کہ ایک بڑی ناور روزگار کتاب ہمارے ہاتھ آگئی جس میں کھانوں کے انگریزی نام اور ان کے جرمن مترادفات لکھے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہم کمرے کی گندھی دلا کر خشک بکٹ ننگے اور پانی پینے سے بچ گئے۔ اس میں لکھا تھا کہ راستہ پوچھنا ہوتے ہو؟ wo ist؟ جس کا مطلب ہے ”کہاں ہے؟“ اس کے بعد مقام مطلوبہ کا نام و بازار و اخلاق

BITTE (پہلے) بھی کہو وہ جواب میں کہے گا۔ NACH RECHTS (دائیں) رشتہ NACH LINKS (بائیں) یعنی بائیں ہاتھ یا یہ کہ سیدھے چلے جاؤ۔ گیراؤ سے اوس GERADEAUS اس کے بعد تم دائیں کے شری (شکریر)

NACHLINKS.....?
NACHRECHTS....?



10

کہو اور اپنی راہ لو۔ اب یہ تمام فقرات جاریے در زبان ہیں، عام طور پر ہمارا مطلوب مقام دہنے ہاتھ باتیں کو یا سیدھا آگے ہوتا ہے، البتہ اگر کہیں ہم اسے پیچھے چھوڑ آئے ہیں اور ایک سے زیادہ موڑ مڑنے کی بات ہو یا ہمارا دیا ہوا پتہ شہر کے دوسرے حصے میں یا کسی دوسرے شہر میں ہو تو تھوڑی دقت ہوتی ہے۔ مخاطب جرمین میں ایک تقریر کرتا ہے۔ ہم یا... یا (ہاں۔ ہاں) کہنے کے بعد سر ہلا کر دل کے شرن کہتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں کہ کوئی تو نے گا جو ہماری جرمین زبان کی معلومات کے اندر رہ کر ہمیں بتائے گا، تو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی۔

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتر ہے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

۱۔ انسان مرکب من الخطا والذیاء ہے شک زبان پر ہمیں اس حد تک عبور حاصل ہو گیا ہے تاہم احتیاطاً ہم یہ فقرے اور الفاظ ایک پرچی پر لکھ کر مع اردو حروف میں ان کے تلفظ کے اپنی جیب میں رکھتے ہیں اور یہ پرچی جب فلاگرون جھکائی دیکھ لی۔ کتاب کا لکھنے والا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سخت اُبے ہوئے اندھے کھانے کا شوقین تھا۔ ہم ہاٹ ہوائی کھاتے ہیں یا ہاٹ فرائیڈ۔ اُس نے اس باریکی کا ذکر ہی نہیں کیا۔ لہذا ہمیں بھی سخت اِجلا ہوا انڈا کھانا پڑتا ہے، یا پھر کل یہ ہوا کہ ہم نے بھنی مرغی کا آرڈر دیا تھوڑی دیر میں بیر یعنی بری ایک بڑا سا قدر اٹھا لائی، معلوم ہوا ہے کہ ہم ردا روئی میں جتنا مرغ BRAT HUHNER کی بجائے HUHNER BRUHE (مرغی کا سوپ) لکھ گئے۔ زیادہ

علم وسیع ہونے کا یہی تو نقصان ہے۔ ہم نے صرف ایک ہی لفظ یاد کیا ہوتا تو یہ قیامت کیوں ہوتی، ہم چاہیں تو جرمن زبان میں منشی فاضل کی ڈگری لاسکتے ہیں لیکن کیا فائدہ بلکہ دانستہ احتیاط کر رہے ہیں کیونکہ ابھی ہمیں پوزیٹو وغیرہ جانا ہے۔ ان لوگوں کی جرمی سے لڑائی رہی ہے، کسی نے ہمیں جرمین سمجھ لیا تو اچھا نہ ہوگا۔ یہ بھی جو کچھ لکھا ہے اسے ہم جرمی کی سرحد پر بھلا کر آگے جائیں گے۔ جیسے اپنی فریج زبان ہم فرانس کی سرحد کے ادھر چھوڑ آئے ہیں یوں بھی آنا سامان کون اٹھائے اٹھائے چھڑے۔

بون اور کولن میں گر جا اسی طرح ایک پر ایک چڑھے ہوتے ہیں جس طرح سنبول میں مسجدیں، اور شان میں بھی یہ استنبول کی مسجدوں پر چٹمک دتی کرتے ہیں۔ کولن کے گرجا کو دیکھئے۔ اس کی رفعت عظمت اور محبت آپ عمر بھر نہیں بھلا سکتے۔ فریگرفٹ سے آتے ہوتے ہم نے افق پر گر جاؤں کے نیلے کلس بھی دیکھے ایک تو ان میں قلعہ کوہ پر بھی ہے خود ہمارے ہوٹل کے نواح میں پانچ چھ پرانے کلیسا ہیں۔ شام کو ان کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ کیا دلاویز سرکاری تانیں اڑا رہی تھیں۔ دل دلوں کو برگ درختاں سبز ہی معرفت کر دگا رکھنے کافی ہیں۔ یہ گھنٹیاں تو پھر صدا رکھتی ہیں۔

ایک تو مٹائی کا عذاب جس کے باعث بعض اوقات گھنٹوں بستر پر پڑے یورپ کا نقشہ دیکھا کرتے ہیں، پھر سیر کرنے والے دوکان اپنی بڑھا گئے۔ ہم نے پوچھا ٹورسٹ آفس سے کہ ہے کوئی جو ہمیں شہر دکھائے، دیاتے راتن کی سیر کرائے

اور اپنے ملک کے لئے ہم سے فارغ ایکس پیج کئے۔ لیکن جواب ملا "نہیں" یعنی نہیں۔ ۳۰ ستمبر کے بعد جائزاً فرض کر لیا جاتا ہے اور یہ تمام تفریحی کاروبار ٹھپ سیاح کو چاہئے کہ کمرے میں بیٹھ کے انٹرنیٹ سے اپنے آخری سفر کے بارے میں راز کی راہ لی، معلوم ہوا کہ وہ تو بالکل ہمارے ہوٹل کے پھوٹو سے واقف ہے، یہ سیر ہماری بون میں آمد کا حاصل کیئے، کیا خوبصورت سیرگاہ ہے، یا پھر ہم نے برسوں پہلے ہائیڈ اور بیچیم کی سرحد کنوک کے ساحل پر ایسا پایا تھا۔ کشتیاں بھی آ جا رہی تھیں، لیکن ان پر جن منزلوں کے نام لکھے تھے وہ ہمارے نقشے میں نہ نکلیں بلکہ ہے چھوٹی بشتیاں ہوں اور کیا عجیب سو دو سو میل دور ہوں لہذا ہم نے خطرہ مول نہ لیا۔ بیچ پر بیٹھ کر لوگوں کی گفتگو نہ سونچیں کہ دیکھتے رہے۔ یہاں ہتی وغیرہ تو نہیں ہیں لیکن جڑوں کا عالم یہاں بھی یہی ہے کہ

چھاتی سے لگا چوم لیا ہو گئے چکے

پھر اٹھ کر کینیڈی پل کے ادھر سے دروازہ شہر میں داخل ہوئے

ادھر رہی کہیں بیتھون کا گھر تھا۔ جی میں آئی کہ اسے بھی دیکھ چلیں، بیتھون کا نام ہمارے جن قارئین نے نہ سنا ہو ان کو معلوم ہو کہ یہ جرمنی کا نامور میسرانی تھا۔ گانوں کی دھنیں بنایا کرتا تھا۔ ہم نے بھی ایک آدھ بار جب ریڈیو بند کرنا بھول گئے ہیں اس کی سمفنی سنی ہے۔ کیا بات ہے اس کی۔ لا جواب آدمی تھا۔ ہم سے تو ایسی دھنیں بھی نہ بنے۔ ہم اپنی طرف سے تو ٹیپاک چلے بلکہ راستوں کی بھول جھلیوں میں گم ہو گئے۔ ایک جگہ ایک مرد بزرگ، لانا ہی سفید داڑھی چہرے پر دانش کی تحریر پیشانی پر جھریں

آٹکھوں پر سایہ کتنے ایک گلی کے موڑ پر کھڑے مل گئے۔ ہم نے تو جرمن میں پتہ پوچھا۔ جب جرمن آتی ہے تو کیوں نہ بولیں۔ لیکن ان بزرگ نے انگریزی میں کہا جیتھون کا گھر پوچھ رہے ہو صاحبزادے؟ وہ سامنے پھاٹک ہے اس کے اندر چلے جاؤ ہم نے کہا۔ "ہماری کتاب میں تو کوئی اور سڑک لکھی ہے۔ یہ تو قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ اس پر ویتانوس نے فرمایا۔" بیٹا جی! جیتھون صاحب اب ہمیں اس سڑک پر اس گھر میں نہ ملیں گے۔ وہ تو بہت دن ہوئے مر گئے۔ پھاٹک کے اندر چلے جاؤ دہنے اتھ دیوار کے ساتھ دس نمبر کی قبر ہے۔

ادریوں اس مردمانے ہمیں بون کے "قبرستان" آسٹریڈیہوٹ میں پہنچا دیا اور ہم نے جیتھون کی ابدی آرام گاہ دیکھ لی اور وہاں ملکوں کا وہ نغمہ سنا جو قبرستان کی چار دیواری کے باہر نہیں جاتا۔ یہ قبرستان اہل کمال کا گنج شایگان ہے جگہ جگہ مٹی کے ڈھیر اور ان پر فاسفون سائنسدانوں شہرہ آفاق طبیعوں پروفیسروں کے ناموں کی تختیاں۔ یہ قبر پر سدا بہار پڑے ہیں۔ کہیں کہیں چراغ نالائین بھی کیونکہ جیٹ پٹا ہو رہا تھا۔ قبریں زیادہ تر پچھلی صدی کی۔ کچھ اس صدی کے شروع میں مرنے والوں کی بھی بعض دوسری جنگ سے چند سال پہلے کی بعض قبروں کے سرانے مجھے بھی تھے۔ عام طور پر ایک خاندان کی قبریں سب یکجا۔ اس وقت تک سب لوگ آکر جا چکے تھے ان ورختوں کے ساتھ اور دم بدم اترتے ہوئے اندھیرے میں یہ دور دیں کارا ہی تنہا تھا کبھی گرے کامریش یاد آتا تھا۔ کبھی کل من علیا فان کا حکم۔ بڑے بڑے خطیب خاموش تھے۔ میٹافنس محو خواب عدم تھے۔ مشرق و مغرب کی فوج کا خواب دیکھنے والے پیادوں کی

چڑیوں پر چڑھنے والے، صحرا صحرانگھوڑے والے صاحبان الکشاف وایجاد، وہ نور علی
 سیاب پا۔ اب اپنی اپنی دو گز زمین کے اعلیٰ میں مست و مطمئن لیٹے آرام کر رہے تھے۔

پھر روز میٹھی فیند میں اے مسکروں و نکیر
 سونے دو بجائی میں تمہکا ماندہ ہوں راہ کا،



کھانا ہمارا سب

یہاں باڈو ڈسبرگ میں ایک عظیم شاندار رہ ہے جس کا کام کلچرل لیکن مینج کا انصرام وغیرہ ہے۔ اس کا جرمن نام ہم لکھیں تو ایک تو یہ تباحث ہے کہ ہجے کی غلطی کر بیٹھیں گے۔ دوسرے وہ ایک آدھ سطر میں نہیں آئے گا۔ ٹھارڈ ٹھارڈ حروف کے الفاظ تو جرمن زبان میں عام ہیں لیکن اب یہ بھید کھلا کہ گھبرانے کی بات نہیں عجم حسن عسکری والے استاد صبر سہار پوری کے کام کی طرح میاں حروف کو ملا کر لکھنے کا رواج ہے کیلے کی ٹیلی جڑ کو یہاں کیلے کیلے لکھیں گے۔ آخر ہم بھی تو اجب جگر ملا کر لکھتے ہیں اور پڑھنے والے اسے "امینٹ بکو پڑھتے ہیں۔ لکھنے میں جگہ بچتی ہے اور کافد کی مہنگائی تو عالمگیر ہے۔

ہم ہر چند کہ جرمن حکومت کے مہمان نہیں لیکن جس بین الاقوامی ادارے کے فرستادہ ہیں اس نے جرمنی کی حد تک ہماری دیکھ دیکھ اسی جرمن ادارے کے سپرد کر رکھی ہے۔ اور واقعی زبان صاحب نے جو ہمارے پروگرام کے ذمہ دار ہیں۔ حق میزبانی خوب ادا کیا اور مس موزیک ٹائمز تو مہربانیوں میں ان سے بھی

بڑھ گئیں۔ بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو خوبے دیگری۔ تارین کرام اپنے اسب
تخیل کو بے لگام نہ ہونے دیں۔ اور بانو ابن پاکستان رشک سے اپنی
انگلیوں کو نہ چبا ڈالیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔

باؤ کو ڈسہرگ ہی میں ہمارا سفارت خانہ ہے۔ ارشد الزماں سے ملنے
وہاں گئے تو سفیر صاحب کو بھی سلام کیا۔ خان عبدالرحمن خاں ہمارے بڑے
کامیاب ڈپلومیٹوں میں سے ہیں لیکن طبیعت اور گفتگو میں بالکل سادہ۔ فرماتے
ہیں: میاں میں تو دیہاتی آدمی ہوں۔ مجھ کو لکھنویت نہیں آئی، اور جرمن لوگ
مجھے اس لئے پسند ہیں کہ سیدھے سادھے پٹھان لوگ ہیں۔ باتوں کے طوطا
میں نہیں بناتے۔ کوئی بات انھیں خوش آئی ہے تو ٹھیک ورنہ صاف جواب۔
پاکستان کے سچے دوست ہیں۔ مدد دینے میں دوسروں سے آگے خود بخود
کے الگ ہیں۔ کسی کے دباؤ میں نہیں آتے۔ پھر مبارک ہیں۔ سارے جرمنی میں ایک
بھی نکھایا احمدی آدمی نہ ملے گا نہ کسی کو کمزور یا مدقوق پاؤں گے۔

گزشتہ اتوار کو کوئٹہ میں ہمارا سیب کھانے کو جی چاہا تھا۔ پونے دو لاکھ
کے تین آئے تھے۔ آج دوپہر ہم مارکیٹ کی طرف جانے کے تو ریڑھی پر سیب
دیکھ کر پھر جی اٹھایا اور انگریزی محاورہ بھی یاد آیا کہ سیب کھاؤ اور ڈاکٹر
کو بھگاؤ۔ پاکستان میں تو خود ڈاکٹر سیب کھاتے ہیں اور فیس کا بتا کر بھی
بھگاتے ہیں۔ ہم نے دکاندار سے کہا کہ یہ تو ایک مارک جتنے جی چاہے دیدو۔
اس نے ایک بڑا تھیلا اٹھایا اور اس میں پندرہ بیس بھر دیئے۔ ہم نے کہا اے

بھلے مانس فقط ایک مارک کے مے۔ ہم خوردہ فروش دکاندار نہیں ہیں کہ ان سیلیوں کی ریڑھی لگائیں۔ فقط ذاتی استعمال کے لیے چاہتے ہیں۔ اس نے کہا جناب یہ ایک ہی مارک کے ہیں۔ وہاں سے جانا تو ہمیں کسی اور طرف کو تھا لیکن اس بوجھ کی وجہ سے سیدھے ہوٹل آئے۔

سیب کو بالعموم دانتوں سے یونہی کھر کھر کھایا جاتا ہے۔ آخر بھی حیوان ایسے کھاتے ہیں تو انسان میں کونسا سرخاب کا پر لگا ہے لیکن اس وقت طبیعت ذرا مائل بہ نفاست تھی۔ ہم نے ہوٹل کی دکان صابن سے چاقو چھری وغیرہ کی فرمائش کی تاکہ کاٹ کاٹ کر کھائیں۔ اتفاق سے وہ ڈکٹری جو جرمن زبان میں ہمارے علم و فضل کی دلدور ہے۔ ہم اوپر کمرے میں چھوڑ آئے اور چھری کی جرمن ہمیں زبانی نہیں آتی۔ داروغہ صابن کو انگریزی میں داخل ضرور ہے لیکن بس ایسا ہی، جیسا ہمیں جرمن میں ہے۔ ہم نے کہا ”نافت چاہیے، اپل کاٹنا ہے“ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ تو ہم نے ایک ہاتھ میں خیالی سیب رکھ کر دوسرے میں خیالی چھری لی اور اسے کاٹا۔ بچاری کندہاں پھر بھی نہ سمجھی۔ اب ہم نے بریک فاسٹ کا حوالہ دیا اور اشاروں اشاروں میں توس پر چھری سے مکھن لگایا۔ یہ اشارہ بھی مکھن لگانے سے زیادہ نائی کے استراتیز کرنے سے زیادہ قریب ہو گیا۔ لہذا ہم نے خیالی سیب کو پھر دو ٹکڑے کیا۔

یہ ایک محترم نے چمک کر کہا ”سیوب“؛

ہم نے بھی خوش ہو کر کہا ”ہاں“ سیب۔ اتنی دیر سے یہی تو کہہ رہا ہوں

کہ سیدب نہاٹا ہے۔ اب لاؤ پھری۔“

ایک روز ہم نے پائن اپل مانگا تھا تو دوکاندار نے کہا ”انٹاس ہتب
ہیں معلوم ہوا کہ یہاں یہ پھسل انٹاس ہی کہلاتا ہے۔ اب یہاں بھی ہم اتنی
دیر سے ”اپل“ کاٹنے کی بات کر رہے تھے۔ شروع ہی میں سیدب کہہ دیتے تو
یہ فوراً سمجھ جاتیں۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ کسی نے اردو اور جرمن زبان کے مشترک
الفاظ پر اب تک کچھ نہیں لکھا۔ کسی کو توفیق ہی نہیں ہوئی۔ شاید اس لئے کہ کسی
کو جرمن آتی ہی نہیں تھی۔ ہم نے طے کیا کہ عظیم الفرصتی کے باوجود وطن واپس
جا کر ہم اس موضوع پر محققانہ مقالہ لکھیں گے۔ ایک تو یہ سیدب ہی مشترک نکلا
اور بھی بہت سے الفاظ ضرور مشترک ہوں گے۔

اتنے میں محترمہ برآمد ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں نہانے کے صابن کی ایک
ٹمکی تھی۔ بولیں ”یہ بوسیوب۔“

آنا برلن اور ٹھہرنا کفرستان میں

برلن۔ برلن۔ برلن ! اے صاحبو حفاظتی بند باندھ لو، برلن آیا جاتا ہے
 کسی اور شہر کے سوا دیں جی پر وہ ہیبت طاری نہیں ہوتی جو برلن پہنچے پر ہوتی
 ہے بشرطیکہ آنے والا کھالوں کا تاجر اور محض ایکسپورٹر امپورٹر نہ ہو۔ یہ شہر ہے
 پر شاکی سلطوت و جبروت والے بادشاہوں کا۔ شاہ فیئرڈرک اعظم کا۔ پرنس
 ہسارک کا۔ قیصر ولیم کا۔ ہٹلر کا۔ آگ اور دھوئیں کا۔ ملکوں کی قسمتوں، کروڑوں
 انسانوں کی تقدیروں کے اعلان یہاں سے ہوتے تھے۔ نوشتے یہاں سے جاری
 ہوتے تھے۔ یہ مرکز کی جن پر اب شگفتہ چہروں والے لوگ چل رہے ہیں اور
 میاں آزاد ہم بے غل و غش قدم مار رہے ہیں۔ یہاں گسٹاپو کا عمل تھا۔ نازیوں
 کے بیش پریش کرتے گزرتے تھے۔ سوسٹیکا کا جھنڈا اہل تھا۔ مائیکروفونوں
 سے نیوہر کی ٹھن گرج سناؤتی تھی۔ زنداں آزادی پسندوں سے بھرے
 تھے۔ نواحیات بندی خانوں سے آباد تھے جہاں لاکھوں بے بس انسانوں کو گیس
 کی بھٹیوں میں جھونک دیا جاتا تھا۔ ان کی چربی سے صابن بنتا تھا۔ ان کی ٹہریں

سے کھا دہنتی تھی۔ اتحادیوں نے اگر ان بندی خانوں کو دیکھا تو فقط زندوں اور مردوں کے ڈھانچے پائے یا گودام درگودام انبار درانبار بچوں اور بڑوں کے جوتوں کے جوڑے ان کے جوتاریک راہوں میں مارے گئے۔ اور آج یہ جلدہ پھر شر ہے خوشحال خوش باش اور خوش نہاد لوگوں کا۔ انسان غلیم ہے خدایا !

ہمارے میزبانوں کی فرستادہ ایک لڑکی ائیر پورٹ پر ہمارا انتظار کر رہی تھی خوش آمدید۔ ہم نے کہا : اے بی بی کیا نام ہے تیرا ؟
بولیں : سُو

”بہت چھٹا نام ہے سُو۔ ہم نے کہا : اے نیک بخت ! ہم دینا تے سُو اور مردان سُو اور علمائے سُو نہ جانے کس کس سے بچتے ہیں تو ہمیں اپنا اصلی نام بتا۔ تب بولی ”بندی کو فرانس کا کہتے ہیں۔ ہم نے کہا یہ ٹھیک ہے۔ فرمایا ابھی آپ کے ساتھ رہنا ہوگا۔ وضاحت بھی کر دی صبح سے شام تک ہم نے کہا اچھا تو ہمیں اپنا شہر بھی دکھاؤ گی۔ تب اس نے جیب سے ایک لانا کاغذ نکالا جو چھپا ہوا تھا۔ ”پرود گرام برائے حضرت ابن اثا آت اسلامکے پبلک آف پابتنی ہم نے کہا۔ ہم سے دفتر نہیں دیکھا جاتا۔ ہم اتنے لوگوں سے نہیں مل سکتے۔ اتنی لائبریریوں کو ملاحظہ نہیں فرما سکتے۔ سخن کو مختصر کرو۔ ہم سے بون ہی میں نیومان صاحب نے کہہ دیا تھا کہ برلن جا کر کام کے جمیلوں میں نہ پڑھنا۔ کچھ شہر بھی دیکھنا۔ بولیں۔ اب تو پرود گرام بن چکا۔ ان لوگوں کو اطلاعاتیں ہر جگہ ہیں۔ اب ان کو منسوخ کرنا ممکن نہیں۔ ہم نے کہا۔ ہم بریڈن برگ گیٹ پر کب جائیں گے۔



برلن — ایک تباہ شدہ گرجا کے پس منظر میں

دیوار کب دیکھیں گے۔ مودی محبوب عالم کا ہونٹ کب تلاش کریں گے۔ پھر مشرقی
برلن بھی ہمیں ضرور جانا ہے۔ ہم نے بون میں تمہارے دفتر سے کہہ دیا تھا لیکن

وہ بچاری کیا کر سکتی تھی۔ بولی۔ شاہیں آپ کی خالی ہیں۔ بیچ میں بھی کہیں کہیں ایک دیکھنے آپ کو مل جائیں گے۔ ان میں آپ چاہیں تو شاپنگ کر لیں۔ ہم نے کہا بی بی۔ شاپنگ کی بات ہم سے نہ کر کہ ہم تو خود اپنے کو بیچنے نکلتے ہیں۔ کوئی دل و جان کا اچھا خریدار ملے تو ہمیں بتانا۔

برلن گئے کہ کو چار حصے ہیں لیکن واقعہ الگ فقط مشرقی حصہ ہے سوڈٹ سیکٹر۔ دیوار کے پچھلے۔ باقی تینوں یعنی امریکی، برطانوی اور فرانسیسی سیکٹر باہم ملے ہوئے ہیں، انتظام سب کا اکٹھا ہے۔ کوئی چوکی پرہ نہیں۔ آپ معلوم نہیں کر سکتے کہ ان تینوں میں سے آپ کس سیکٹر میں ہیں۔ سوڈٹ سیکٹر یعنی مشرقی برلن۔ وہ البتہ !

مغربی برلن کی مرکزی شاہراہ کا نام ہے KURFURSTEN اسے اپنے حساب سے پڑھا تو آواز نیکی۔ "کفرستان" اسی پر ہمارے ہوٹل کا نام تھا "ہوٹل کفرستان" یعنی کفر کا دم چھلہ بیان بھی ہمارے ساتھ رہا۔ ع یاروں کو تجھ سے حالی کیا بدگمانیاں ہیں

ہم نے پہلے تو احتجاج کرنا چاہا کہ اسلامک ری پبلک کے آدمی کیسے آپ نے اس نام کا ہوٹل کیوں مقرر کیا۔ پھر اس خیال سے چپ ہو گئے کہ اس ہوٹل میں اور اس شاہراہ پر تہان کا فر سے ٹڈ بھڑا ہوا کرے گی۔ کیا عجب کوئی موقع تبلیغ کا نکل آئے۔ اور کوئی ان میں سے راہ راست پر آکر ہمارے دست

حق پرست پر بیعت بھی کرے لیکن اسے بسا آرزو کہ خاک شدہ کسی کافر کو تو ہم
اپنی راہ پر نہ لاسکے۔ اس ہمارا ایمان ضرور کئی بار متزلزل ہوا۔

ہوٹل ہمارا اچھا تھا۔ اتنے دنوں بعد ڈھنگ کا ہوٹل رہنے کو ملا یورپ
میں نجی ہاتھ روم والا ہوٹل ایک نعمت ہے جو پہلی بار نصیب ہوئی۔ ورنہ کسی نہ کسی
حاجت (ضروریہ وغیر ضروریہ) کے لئے باہر جانا پڑتا ہے۔ چوغہ یا جھیر بھالا
یعنی ڈریسنگ گون ہم نے خاص اسی مطلب سے خریدا۔ فریکفرٹ والا ہوٹل یہاں
بھی اچھا تھا لیکن اس کے مقابلے میں غیر دو۔ بون کا ہوٹل بنز نسبتاً سستا معلوم
ہوتا تھا۔ لیکن مینجر صاحب نے بل بنایا تو اس میں تین مارک کسی چیز کے الگ لگے
تھے۔ ہم نے کہا یہ کیا۔ بولیں آپ ایک روز نہائے جو تھے غسل خانہ مشترک
سہی لیکن آپ نے استعمال جو کیا ہے تو اس کے پیسے بھی دیجئے۔ ہم نے شکر
کیا کہ چار دن میں فقط ایک بار نہائے۔ ورنہ ہم اپنے حلقے میں پانی کا جانور کہے
جاتے ہیں۔ روز نہاتے ہیں۔ ہوٹل بنز میں بھی ہم سے یہ حرکت ضرور ہوتی۔ لیکن
ہمیں غسل خانہ ملا ہی نہیں تھا۔ پوچھنا پڑا کہ آخر یہ چیز ہے کہاں؟ معلوم ہوا اوپر
چھت پر ہے۔ بیت الخلا میں البتہ آپ بغیر پیسے دیئے مدار پر جا سکتے ہیں۔ بل
میں تین مارک لکھے تھے۔ ہم نے کہا اس کی دھماکت بھی ہو جائے۔ فرمایا

آپ کے کمرے میں کمرہ گرم کرنے کی سلاخیں لگی ہیں نا؟ یہ تین مارک HEATING
کے۔ ہم نے کہا وہ تو ہم نے استعمال ہی نہیں کیں بلکہ رات کو کھڑکی کھول دیتے تھے
تاکہ تازہ ہوا آتی رہے۔ کمرے میں تو جس تھا۔ بولیں: استعمال کرنے نہ کرنے کی



برلن کا ایک چوک

سند نہیں ہے۔ پیسے تو دینے ہوں گے۔ ہم نے حساب جوڑا تو وہی پایا جو اچھے ہوٹلی کا ہوتا ہے۔

صرف کفرستان ہی نہیں۔ اور بھی کئی لفظ ہم نے اپنے حساب سے یاد کئے
 ناشتے کے لئے جو میں بڑا ٹیڑھا لفظ ہے FRUSTUCK۔ ناشتے کے کمرے
 پر لکھا نظر آیا۔ FRUSTUCKRAM ہم نے کہا وہ مارا یہ فرس تکا رام کی غرض
 ہے۔ سنت تکا رام کا نام کس نے نہیں سنا۔ اگرچہ یہ کون تھے اور کیا کرتے

تھے تاریک کراہ کی طرح ہمیں بھی معلوم نہیں۔ فرس کا مطلب گھوڑا یعنی سنت
 سکرام کا گھوڑا۔ ظاہر ہے سنت صاحب کے زمانے میں گھوڑے ہی کی سواری
 ہوتی ہوگی۔ لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ جرمنوں نے ناشتے کے کمرے کے لئے یہ بے شکا
 نام کیوں رکھا۔ گھوڑے کو ناشتے کے کمرے سے کیا نسبت تا آنکہ یہ رعایت
 ملحوظ نہ ہو کہ دلی والے بھی نہاری کھاتے ہیں اور پنجاب میں تانگے کے گھوڑوں
 کو جو بھوسا چنے وغیرہ دیئے جاتے ہیں وہ بھی نہاری کھاتے ہیں۔ ہماری تحقیق
 کا ٹوٹا اس میدان میں یہیں تک جاتا ہے آگے اپنے قیل معنی کو متحقق نکالیں۔

ہوائی سفر کے آرام پر سب کی نظر ہے لیکن اس کی باتوں اور صعوبتوں کو
 وہی جانتا ہے جو اس سے بار بار گزرے اور جسے اپنے اسباب کا وزن حد میں
 رکھنے کے لئے اسے بار بار کاٹنے سے توڑنا پڑے اور چیزوں کو پھینکنا پڑے۔
 ہم تمام مسافروں کے مقابلہ میں دس گز زیادہ سہ جانی کا سہی رکھتے ہیں گلی تیس کو
 یعنی جیسا شہر پڑے۔ لیکن لندن سے چلے تو سترہ گز زیادہ تھے۔ جس کے پیسے الگ
 دینے پڑے۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ اس میں کوئی چیز غیر ضروری ہوتی ہے۔ ہم محتاط آدمی
 ہیں۔ کچھ وزن تو ہمارے ساتھ چورن اور ہاضمے کی گولیوں کا ہے، اتنا ہمارے
 اس لئے ہم نے خاصا ذخیرہ ساتھ رکھا ہے۔ میزائل کی بھی چند شیشیاں ہیں جانے
 کب ختم ہو جائے۔ پردیس میں کہاں ڈھونڈتے پھریں گے کہ ہمیں روغن اُرد خاص
 انخاص یا بادون جڑی بوٹیوں والا تیل چاہیے۔ کچھ پلنے والے نقوش اور فنون کے
 سانچے اور بعض ضخیم ناول اور تنقید کی کتابیں بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ تنہا آدمی

کا ہی گھبراتا ہے۔ مطالعے کے لئے ساتھ کچھ نہ کچھ رہنا ہی چاہیے۔ ایک سیٹ ہمارے ساتھ ہمارے دوست عبدالعزیز خالد کی کتابوں کا بھی ہے جن کی مدد سے ہم عربی سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں قاہرہ وغیرہ جانا ہے اور جامع ازہر کے شیخ سے گفتگو کرنی ہے۔ کچھ پڑھنے والے ہم نے لندن سے خریدے۔ پھر ہر شہر کے نقشے، گائیڈ بکس وغیرہ بھی ہیں۔ ہمارا جی تو اسائیکلو پیڈیا بریٹیکا بھی ساتھ رکھنے کا تھا کیونکہ پریس میں معلومات کی بڑی ضرورت رہتی ہے لیکن اسی سامان کے بوجھ کی تدخین کی وجہ سے نہ لاسکے۔ ہماری بوجھ اٹھانے کی صلاحیت بھی محدود ہے۔ کیونکہ منڈی میں اندراج کی بوریاں ڈھونڈنے کا کام ہم نے نہیں کیا۔ یورپ میں قی نہیں ملتے اور سوٹ کپس گٹھڑیاں، پونٹیاں، بریف کپس، تھیلے، اتنا کچھ ہمارے ساتھ ہے کہ ہم گنتی تک بھول جاتے ہیں۔ یورپ والے کوئی چیز دیتے ہیں تو اس کا تھیلہ اتنا خوبصورت ہوتا ہے کہ اسے پھینکنے کو ہی نہیں چاہتا۔ پورٹر کمپن لی گیا تو اس کا منہ موتیوں سے بھرنا پڑتا ہے۔ ہمیں بس نے فریگفرٹ کے ہوائی اڈے کے غلط دروازے پر اتار دیا تھا۔ پورٹر نے صبح دروازے تک پہنچایا۔ ہم نے چار روپے دے کر یہ جانا کہ خوش گیا لیکن اس بندہ خدا نے تھوڑا کی کہ چھ روپے دو، اور بے کر ٹلا۔ اس پر اپنے قی یاد آئے۔ تین ٹرنک سر پر ہیں، آپ کے بستر کمپن کو جس میں دو رضائیاں، کمبل، جوتے اور کراٹے سے بچنے کے لئے نہ جانے کیا کیا آپ نے باندھ رکھا ہے، اپنے کاندھے میں محائل کرتا ہے اور پھلوں کی ٹوکری ایک ہاتھ میں، تھیلہ اور صراحی دوسرے میں، ناشتہ دان کمپن سے لٹکا ہوا۔ بوجھ سے لہراتا ہوا چلتا ہے۔ پل پار کرتا ہے آنکھیں باہر نکلی پڑتی ہیں اس کے بعد التجا



کرتا ہے کہ اسے چار پیسے زیادہ مل جائیں۔ بعضے نیک دل دونی چوٹی قسے دیتے ہیں۔ بعضے ڈانٹتے ہیں قانون کا حوالہ دیتے ہیں۔ ایک زمانے میں ایک آنرانی نیک فی پھیرا کراہے تھا۔ انہی کی شکل بھی بنی رہتی تھی کہ کوئی زیادہ مانگے تو اسٹیشن ماسٹر کے پاس رپورٹ کی جلتے۔ اب شاید دونی یا چوٹی کا ریٹ ہے۔ گاڑی چل دیتی ہے تو ہمارا یہ بھائی پاکستان کی روز افزوں ترقی اور اقبال مندی کا حصہ دار لال ٹھوس سر کے نیچے رکھ پیٹ فام پر آرام کرنے کو ریٹ جاتا ہے اپنے روشن مستقبل کی ٹرین کے انتظار میں جس کا سگنل سنیں گرتا، جو آئیں پاتی۔

جب سے ہوائی سفر کا رواج ہوا ہے، لوگوں میں باہم محبتیں بھی کم ہو گئی ہیں۔ خلوص بھی رخصت ہوتا جا رہا ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ پر مٹی باندھے اکڑا بیٹھا ہے۔ یہ نہیں کہ پاس والے سے کلام کرے۔ اس کی خیریت پوچھے۔ ذات پات وطن دریافت کرے۔ مسائل حاضرہ پر چننے گفتگو ہو۔ کچھ آل اولاد کے کوائن دریافت ہوں۔ کہتے بچے ہیں، کیا کرتے ہیں۔ بکتنوں کی شادی ہو چکی۔ جہیز میں کیا آیا۔ گھمیر کب آزاد ہوگا۔ عرب کیسے جیت سکتے ہیں۔ سچا مسلمان بننے کی کیوں ضرورت ہے۔ نئی نسل میں بے راہ روی اور بے شرمی کیوں پھیل رہی ہے وغیرہ اس کے علاوہ ہوائی سفر میں آزادی بھی محدود ہے۔ آپ بس اپنی سیٹ پر بیٹھ سکتے ہیں۔ چادر بچھا کر پوری برتن پر پاؤں نہیں پھار سکتے۔ جیسے ہم تھرڈ اور انٹر میں کرتے ہیں۔ نہ ٹرنک اور پچھلیاں پھیلا کر دوسرے مسافروں کا راستہ روک سکتے ہیں۔ پھر ریل میں آپ کے پاس آموں کی ٹوکر ہی ہے، مزے سے آم کھائیے اور

اس کی گھٹیاں فرش پر پھینکے کسی کی کیا مجال جو ٹوک سکے۔ اگر بلا سفر ہے اور براہِ پنج لائن ہے۔ آپ کو تو بڑیکہ سنگھ جانا ہے تو حقہ بھی ساتھ رہنا چاہیے اور قبلا کو اور اُپلوں کا تھیلہ بھی۔ اپنے نہیں تو گاڑی کے فرش پر کاندوں سے آگ جلائیجئے۔ دھوئیں لگا کیا ہے کسی صورت باہر نکل جائے گا۔ جہاز کے سفر میں تو چڑھتے اترتے دقت "توا سمو کنگ" کا حکم رہتا ہے۔ اور اس بے آرامی کے کھڑاگ کا نام کیا رکھا ہے۔ "ہوائی جہاز"

بہت تیری ہوائی جہاز بنانے والے کی۔



عفتی محبوب عالم ایڈیٹر سپر اخبار

برلن۔ ہمارا اور منشی جی کا

ہم جن گائیڈ بکوں کی مدد سے بلا دیورپ کا سفر کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک تو ۱۹۶۶ء کی چھپی ہوئی ہے جس کا نام ہے۔ "یورپ میں پانچ ڈالر روزہ میں گزارا کیسے کیا جائے"۔ اس میں جگہ جگہ کے ہوٹلوں، سرائوں، ڈھابوں اور سستے ٹھکانوں کے پتے دیئے گئے ہیں۔ یہ سال بھر پرانی ہے۔ اس لئے بہت سی باتیں غلط ہو گئی ہیں بلکہ ہمارے تو یہ کسی کام نہ آئی۔ اسٹینول میں جاسے دوستوں نے ڈیڑھ ڈالر روزہ کا ہوٹل تلاش کر کے مصنف کتاب کو زکریٰ اور ولایت میں کہیں ہمارا گزارا آٹھ دس ڈالر سے کم میں نہیں ہوا۔ دوسری گائیڈ بک کی بتائی ہوئی ہدایتیں بھی بہت دور اندازہ ہیں۔ اول تو اس کا مصنف ہٹن ہوٹل سے کم میں کہیں ٹھہرا نہیں۔ دوسرے اس کے سال طباعت ۱۹۵۵ء سے لے کر اب تک دنیا بدل گئی ہے۔ تیسری کتاب کے بتائے ہوئے آتے پتے البتہ بہت جگہ صحیح نکلے۔ یہ اصل میں ایک سفر نامہ ہے۔ آج سے سترھ سال پہلے ۱۹۰۰ء کے سفر کا تصنیف لطیف منشی محبوب عالم ایڈیٹر ملیہ

اخبار۔ وزن اس ضخیم کتاب کا کوئی دو پونڈ کے قریب ہو گا۔ ہوائی سفر میں ہر بار جو ہمیں زائد اسباب کا جرمانہ دینا پڑتا ہے وہ بڑی حد تک اسی کتاب کے باعث ہے۔ برلن میں اس کتاب نے ہمیں بہت دوڑایا۔ ہم نے پوچھا فریڈریش سٹراس کہاں ہے تاکہ قیصر ہوٹل دیکھا جائے جہاں مولوی صاحب ٹھہرے تھے۔ بتانے والوں نے بتایا کہ یہ سڑک تو مشرقی برلن میں ہے اور بہت طویل ہے۔ پہلے اس ہوٹل کا مکان نمبر تو معلوم ہو — پھر چاہے ہوٹل رہا ہے یا نہیں رہا ہے۔ کم از کم وہ پرانی عمارت یا جاتے وقوع تو دیکھ لو گے۔ لہذا پہلی جستجو پرانی ڈائرکٹریوں کی ہوئی یہ مغربی برلن کی اسٹیٹ لائبریری میں مل گئیں جہاں یہ لوگ ہمیں لاطینی زبان کے خطوط دکھانے لگے تھے۔ ۱۹۱۷ء کی ڈائرکٹری ہاتھ آئی۔ اس میں قیصر جوف نامی ہوٹل کا پتہ درج تھا — کسی اور سڑک کا۔ ہم نے کہا — یہ نہ چاہیے۔ سب سے پرانی ڈائرکٹری اس ذخیرے میں ۱۸۷۰ء کی تھی۔ اس میں بھی دُرِ مقصود ہاتھ نہ آیا۔ آخر ہم نے کہا۔ بس اس سال کی دیکھنی چاہیے۔ ۱۹۰۰ء کی۔ خوش قسمتی سے مل گئی اور اس میں پتہ بھی صحیح تھا۔ مکان نمبر بھی دیا تھا ۱۷۸، مالک کا نام اور ٹیلی فون نمبر بھی درج تھا۔ نمبر ۶۳۷۔

دوسری چیز جس کی ہمیں تلاش تھی وہ برلن کے ایک پرانے اخبار بریئر ٹاگ بلاٹ یعنی ”روزنامہ برلن“ کا ایک پرانا پرچہ تھا۔ منشی جی نے برلن پہنچتے ہی پانچ چار اخباروں کے ایڈیٹروں کو ملاقات کے لئے خط لکھ دیئے تھے۔ قریب قریب سب کے جواب دوسرے روز مل گئے۔ بلکہ — بریئر ٹاگ بلاٹ جو میان کا ادل درجے کا آزاد اور انٹرنیشنل اخبار سمجھا جاتا ہے اس کے ایڈیٹر

ڈاکٹر میوی سن نے میرے خط کا جواب بذریعہ "اوریہ پوسٹ" یعنی دم کشی کی ڈاک سے اسی سہ پہر کو بھیج دیا تھا۔ یہ طریقہ خط بھیجنے کا بھی برلن میں عجیب ہے۔ جس خط کو شہر کے دوسرے حصے میں بھیجنا مطلوب ہو، اس پر معمولی ڈاک سے دو چند محصول کا ٹکٹ چسپاں کیا جاتا ہے۔ یہ خط ایک نٹلوں کے سلسلے کے اندر سے بذریعہ ہوا کے زور کے پہنچاتے جاتے ہیں یعنی نٹکے میں خط ڈال کر چھپے مشین کی ہوا سے دھکا دیا اور دم زدن میں منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ جہاں سے تار کی طرح جھلدی ہی تقسیم کر دیتے گئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ لندن میں بھی یہ طریق ڈاک کا جاری ہو گیا ہے۔ اور پریس میں بھی۔

غرض تھپی پاتے ہی میں ۷ جولائی کو ۸ بجے شام کے مقررہ وقت پر برلینر ٹاگ بلاٹ کے دفتر میں پہنچا۔ ڈاکٹر میوی سن اپنے کمرے سے باہر نکل کر مجھے اندر اپنے ساتھ لے گیا۔ ہندو مسلمانوں کی آبادی اور گورنمنٹ سے رعایا کے تعلقات پر گفتگو ہوئی۔ اور جب میں نے بھی یا کہ کانگریس والے وہی خدمات سرانجام دینا چاہتے ہیں جو کسی زمانے میں فریق متقابل گورنمنٹ (پوزیشن) ادا کرتا ہے تو اس کا ظن رفق ہوا کہ رعایا سرکار سے ناراض نہیں۔

میرے پاس پیسہ اخبار کا نمونہ موجود تھا۔ جرمن ایڈیٹر اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس کی قیمت کی ارزانی اور مقدار اشاعت دونوں باتوں کو پسند کیا بلکہ مجھ سے وہ پرچہ لے لیا اور اپنے دوسرے روز کے اخبار میں میسری ملاقات کی کیفیت مع پیسہ اخبار کے ایک کالم کے فوٹو گراف کے چھاپ دی۔

ہم محقق نہیں ہیں لیکن محققوں کے قیصرِ شید تو رہے ہیں۔ اور گو کسی کا بچ
یونیورسٹی میں آج کل نہیں پرواں کے نکالے ہوئے تو ہیں۔ رجحان ہمارا اہل علم
ہی کا سا ہے کہ دلی دکنی کے بیٹے کے ختنوں کی صحیح تاریخ معلوم ہونی چاہیے خواہ
اس کے لئے کسی کو پی ایچ ڈی کیوں نہ بنانا پڑے۔ پس ہم اس مسئلے سے بچ گئے
کہ یہ پرچہ تلاش کرنا چاہیے۔ اور اس کا نوٹ لے کر چھپوانا چاہیے تاکہ صاحبان
تحقیق میں ہمارا نام لکھا جاتے۔ سب سے پہلے تو ہم فریڈرکٹ یونیورسٹی میں
گئے اور اس اخبار کا آئنا پتہ دریافت کیا۔ معلوم ہوا اس کا کوئی ناسخ فریڈرکٹ
مجموعہ میں نہیں ہے۔ پھر کولون اور ہون میں جاتے ہی لائبریریوں کے پھرے کیے۔ یہ
مناجاتیں بھی نہ ملی۔ مغربی برلن چنچتے ہی ہم نے میزبانوں سے کہا کہ ہاتھی نہیں چاہیے
گھوڑا نہیں چاہیے۔ سن برٹیز ٹاگ بلاٹ کا یہ پرچہ چاہیے، اس کے لئے ہم نے
منادی کرائی۔ گماشتوں کو مختلف علاقوں کے کتب خانوں میں دوڑایا لیکن خالی
ہاتھ واپس آئے۔ ایک لائبریری یہاں کی مایہ ناز گنی جاتی ہے۔ ایک اونچی عمارت
ہے، لاکھوں کتابیں ہیں۔ ہمیں اس کے کتا دھر تا بڑے آدر کے ساتھ لے گئے
تھے کہ ہم دیکھ کے تعریف کریں گے۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے لیکن اگر جوابی ۹۰۰
کا برٹیز ٹاگ بلاٹ ہمارے پاس نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے اپنا سامنہ لے کر
رو گئے۔

تب ہم نے کہا اب ہم مشرقی برلن جاتے ہیں۔

یہ ظالم ہمارے مغربی جرمنی کے میزبان میں لوگوں سے ملانے اور لائبریریاں



برلن میں کارگروں کے بھستے

دلکھنے میں اتنا معروف رکھتے تھے کہ مشرقی برلن جانے کا وقت ہی نہ ملتا تھا۔
 آخر میں لائبریریوں سے ہم یہ کہہ کر بھاگے کہ ہماری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور
 میدھے شاڈبان کے اسٹیشن پر پہنچے۔ شاڈبان اے سادہ لوح قارئین کو مسمیٰ
 بلکہ یا چڑیا کا نام نہیں ہے۔ بلکہ ایک خاص ریل کی سواری ہے۔ اس کے ڈبوں میں
 بھی کوئی سرخاب کے پر نہیں لگے تو پھر یہ کیسا ہے؟ ہمیں برلن جانے سے پہلے ہی
 منشی محبوب عالم کی زبانی معلوم ہو چکا تھا۔

”شہر کے اندرونی حصہ کے گرد اور عام طور پر شہر کے اندر ایک حلقہ ریل
 کا گزرتا ہے جس کی سڑک ایک منزلہ مکانات کی چھتوں کے برابر یا پس فٹ بند ہے
 اور اس سڑک کے نیچے ۶۰ میل شہر کے اندر ہیں جرمن اس کو شاڈبان یعنی شہر کی

ریل کہتے ہیں۔ اس کے بیشن دو دو میل کے فاصلے پر ہیں۔ گاڑی ہر پانچ منٹ کے بعد ہر اسٹیشن سے دونوں طرف روانہ ہوتی ہے اور نصف منٹ سے زیادہ کسی اسٹیشن پر نہیں ٹھہرتی اس ریل کو پرس بسمارک نے تجویز کیا تھا۔ ٹکٹ دینے کے لیے کوئی شخص نوکر نہیں البتہ چند مشینیں میٹر بسوں کی طرح کھڑی ہیں جب کوئی ان میں فینی کا سکہ ڈالتا ہے۔ جھٹ ایک ٹکٹ تیسرے درجے کا ان کے ایک منہ سے گر پڑتا ہے۔

سڑک سال میں اگر اس معمول میں کوئی فرق ہو تو یہ کہ اب ریل پانچ کی بجائے ہر پندرہ منٹ بعد چھوٹنے لگی ہے اور ٹکٹ دینے کا سلسلہ آٹومیک نہیں رہا بلکہ آدمی کھڑکی میں بیٹھا پیسے لیتا ہے ٹکٹ دیتا ہے۔ آٹومیک سلسلہ ہم نے فقط مشرقی برلن کی بسوں میں دیکھا۔ اس فرق سے قطع نظر پل وہی راستے وہی ہیں۔ اسٹیشن وہی ہیں۔ اور شاید کچھ گاڑیاں بھی وہی ہیں جن میں ہمارے منشی صاحب بیٹھے رہے ہیں۔ ہم بھی بیٹھ کر اترے تو مشرقی برلن میں اسی اسٹیشن پر اترے۔ جہاں سے منشی صاحب چڑھتے اترتے ہوں گے۔ فریڈریش سٹراس کا اسٹیشن۔ سٹراس کا مطلب روڈ ہے۔ ہر سڑک کا نام اس پر تمام ہوتا ہے۔

مشرق برلن کا کسٹم والا ہمارے تھیلے کے کاغذوں کتابوں کی پڑتال میں کچھ زیادہ ہی دیر لگا رہا تھا بلکہ ہمارا ایک آرٹیکل ایک جرمن رسالے میں چھپا ہے وہ بھی شومئی قسمت سے بے یں تھا۔ اس کا بالاستیغاب مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ ہم نے کہا اے بھیا۔ چھوڑ اسے۔ اپنے پاس رکھ لے اور ہمیں اسٹیٹ لائبریری کا پتہ بتا۔ اس پر وہ بھلا مانس چونکا اور کہا۔ جاؤ فریڈریش سٹراس سے انٹرون لینڈن

بائیں ہاتھ مڑو۔ تھوڑی دیر بعد بائیں ہاتھ کو اسٹیٹ لائبریری جے تے اسٹاٹ بلیو تھک آٹھ بجے تک کھلی رہے گی۔“

ہم نے مشرقی برلن کے سیاسی اور اقتصادی حالات اور دوکانوں کا مطالعہ آئندہ پر چھوڑا اور لائبریری کا رخ کیا۔ بڑی پرشکوہ عمارت ہے۔ چوڑے پاٹ کی سنگین اور بلند دیوار، جنگ میں ایک حصہ تباہ ہو گیا تھا لیکن زیادہ ترمیم رہی کتنی ہی سیڑھیاں چڑھنے اور غلام گروٹوں سے گزرنے کے بعد رسالوں اور اخباروں کا شعبہ آیا۔ بہت سے لوگ سر جھکاتے پڑھ رہے تھے۔ فائل مختلف میزوں پر پڑے تھے۔ ایک بی بی لائبریرین سر جھکاتے اپنا کام کر رہی تھیں۔ ہم نے عرض مطلب کیا کہ ہم بریئر ٹاگ بلاٹ کی تلاش میں آہنی پروسے کے پیچھے آئے ہیں۔ ہمارا سوال پورا ہونا چاہیے۔

یہ محترمہ بہت کم انگریزی جانتی تھیں۔ اٹک اٹک کر بولتی تھیں۔ فرمایا: ٹیل تو جاسے گا لیکن کل جو صاحبہ انچارج ہیں وہ موجود نہیں، پانچ بجے چھٹی کر جاتی ہیں۔ ہم نے کہا ہم عمر میں پہلی بار برلن آئے ہیں اور آج جا کر شاید نہ لوٹ سکیں کچھ کرو کامریڈ ہمارے لئے۔“

بچاری بہت اچھی تھیں۔ ہم نے بات میں زور پیدا کرنے کے لئے کہا ”ہمارے دادا یہاں آئے تھے۔ ان کا ذکر اور ان کے اخبار کارڈوں اس میں چھپا ہے (ہمارے مذہبی ہمارے دوست حبیب عالم کے دادا تو تھے) رشتے کے حوالے سے ان کی دلچسپی بڑھ گئی اور بچاری نے ایک لمبا فون کیا۔ اور پھر خود اٹھ کر گئیں۔ آدھے گھنٹے میں ایک فائل نکال کر لائیں۔ اور جولائی ۱۹۰۰ء کا بریئر ٹاگ بلاٹ

ہمارے سامنے تھا۔

ہمارے منشی جی، جولائی کو اس کے ایڈیٹر سے ملے تھے۔ اور ان کے بیان کے مطابق دوسرے دن کے پرچے میں پیسہ اخبار کا نوٹ چھپا تھا۔ ہم نے ۸ جولائی کا پرچہ نکالا۔ اس میں کچھ نہ پایا تو ۹ جولائی میں جہانکا کہ شاید پھر دس جولائی، گیارہ جولائی، بارہ جولائی، تیرہ جولائی، چودہ جولائی۔ آخر ایکس جو کہ فائل بند کر دیا محنت اکارت گئی۔ پیسہ اخبار کا غلصہ کیس نظر نہ آیا۔ جی میں طرح طرح کے دسویں آئے منشی جی نے یونسی تو نہیں اڑادی تھی۔ احتیاطاً ہم نے سات کا پرچہ بھی دیکھ ڈالا۔ آٹھ، نو۔ دس کا ایک ایک کالم بہ نظر غائر پھر دیکھا۔ یہ تراشہ ہمیں نہ ملتا تھا نہ ملتا۔ آخر اس بی بی سے ہم نے کہا۔ ابھی اخبار لوٹا ہے نہیں۔ کل ہمیں وقت ملا تو پھر آئیں گے۔

دل میں عجب دہجہ مالتھا۔ سفر نامہ آکر دوبارہ پڑھا۔ اس میں وہی دوسرے دن کا حوالہ تھا۔ تیرہ کو تو منشی جی برسی سے چلے ہی گئے تھے، انھیں دھوکہ ہوا کیا؟

اگلے روز دیکھنا تو ہمیں ہسٹری کا میوزیم بھی تھا کیونکہ پہلے روز لاٹبریری میں اتنا وقت لگا کہ میوزیم بند ہو رہا تھا۔ لیکن قدم کٹاں کٹاں لاٹبریری ہی میں سے گئے۔ اب ہم نے سوچا کہ ٹھہر ٹھہر کر پورے مینے کا پرچہ دیکھیں گے۔ چودہ کے بعد پندرہ جولائی کے شمارے کے آٹھ صفے اٹھے تھے کہ نویں صفہ پر پیسہ اخبار اور اردو تحریر نظر آئی۔ ہم نے اطمینان کی ایک ٹھنڈی سانس لی منشی صاحب کے متعلق جو ذرا سی بدگمانی ہوئی تھی۔ اس پر افسوس بھی ہوا۔ یہ غلصہ پیسہ اخبار، یوم ثلثہ ۴ اپریل

.. ۱۹ د کے انوار قلم کا تھا۔ سرخی تھی۔

”تعلیم اسلام حکومت انگریزی کی کیسی متوید ہے“

سرخی کے نیچے ایڈیٹر کا نوٹ :-

”حالی ہی میں دو یوروپین آفسروں کے ایک جاہل سرحدی آفس کے ہاتھ سے بلاوجہ قتل کے جانے پر جو رائے میں پیسہ اخبار میں ظاہر کر چکا ہوں کہ ایسی شجاعت اور سخاوت کی کاروائی کسی طرح بھی باعثِ ثواب نہیں ہو سکتی۔ اور نہ کوئی سچا مذہب اس کو روا رکھ سکتا ہے۔ اس کی تائید میں ایک ضروری سرحدی ایٹشن کے تمام معزز طبقہ کے مسلمانوں کی رائے مجھے دستیاب ہوئی ہے۔ میں ان کالموں میں اسے نمایاں جگہ دیتا ہوں :- (ایڈیٹر)

اس کے نیچے کی تحریر کس کے قلم سے ہے معلوم نہیں ہو سکا۔ کیونکہ قلم کا اختتام ایک نامکمل فقرے پر ہوتا ہے۔



رائٹ برادران سے رجب علی سرور تک

یورپ والوں کی خوسیاں اپنی جگہ لیکن یہ لوگ ہیں کم سواد ہو سکتا ہے ہم غلط لوگوں سے ملتے رہے ہوں۔ بہر حال ذاتی تجربہ یہی ہے کہ ہر چند ہم نے بات سے بات نکال کر جتایا کہ ہم شاعر ہیں۔ کسی نے خاص اعتنا نہ کیا۔ ہمارا دیوان جیلا بستے میں ہم نے باندھا تھا ویسا بندھا ہے۔ ایک صاحب سے تعارف ہوا کہ یہ بھی مصنف ہیں۔ ہم نے اشتیاق سے پوچھا۔ کیا لکھتے ہیں آپ؟ شاعری؟ ناول؟ بولے جی نہیں۔ میرا مضمون الکٹر انکس ہے۔ ہم پوچھنے کو تھے کہ الکٹر انکس کیا ہوتی ہے؟ لیکن ازراہ مصلحت باز رہے۔ ایک ادارہ کتابیں تیار کر رہا ہے۔ جو پاکستان بھی آئیں گی۔ ہم بھاگے بھاگے وہاں گئے۔ معلوم ہوا ادھاتوں پر کیمیاوی اثرات، ویڈنگ، خرا اور آئل ٹیکنالوجی وغیرہ کی کتابیں ہیں۔ ہم نے بہت کرایہ کی کٹلم بریج و معانی کی کوئی کتاب بھی شاید ہو۔ اور صنعتوں ہی پر زور ہے تو صنعت تو شیخ مراعات النظر ہے فقط وغیرہ کئی صنعتیں ہم نے ایم اے میں پڑھی تھیں ان پر کچھ کام ہونا چاہیے۔ جیسا ہمارے اہل ہوتا ہے کہ ایک صاحب نے

کتاب لکھی جس کی ہر سطر اور ہر لفظ سے تائید بخٹکتی ہے۔ سن بھری یا سال عیسوی برآمد ہوتا ہے۔ لیکن جہاں۔ یورپ والوں نے صنعت کے لفظ کے معنی ہی بدل دیئے ہیں۔ کہاں تو یہ شریف اصطلاح زبان و بیان کی باریکیوں کے لیے استعمال ہوتی تھی یا اب لوہے فولاد کی میاوی کھاوتیل وغیرہ کے کارخانے صنعتیں کہلانے لگے ہیں۔

کچھ دنوں تو ہم لوگوں سے سائنس اور صنعت و حرفت وغیرہ کی باتیں سنتے رہے لیکن ایک دن ہم سے راز لگیا۔ ہم نے کہا یہ کیا آپ لوگ سائنس اور ٹیکنالوجی وغیرہ کی رٹ لگاتے ہوئے ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے بھی اس خصوص میں بہت کام کیا ہے۔ میڈیکل سائنس میں ایسی دستگاہ تھی کہ ایک ہمارے حکیم نے ایک صاحب کی بد معاشی کی فوراً تشخیص کر دی کہ تم نے تمبروز مبت لکھا یا ہے۔ محض عقل اور قیافے کے زور سے اور محض یہ دیکھ کر کہ مریض کے بارہ گرد و تمبروز کے پھلے بکھرے تھے۔ اسٹراٹومی یعنی علم ہیئت میں اب بیشک روس اور امریکہ وغیرہ کے حوصلے کھل گئے ہیں کیونکہ ہم میدان میں نہیں ہیں۔ ہماری توجہ دوسرے ضروری امور کی طرف ہے ورنہ ہمارے مدرسوں میں درس نظامیہ میں علم ہیئت بھی پڑھاتے تھے۔

ایک صاحب کو دلچسپی پیدا ہوئی، بوسے یہ علم ہیئت کپلر اور کوپر نیکیس وغیرہ والا۔ ہم نے استہزائیہ ہنسی ہنس کر کہا۔ یہ لوگ تو ابھی کل کی پیداوار ہیں۔ ہمارے حکمائے ان سے صدیوں پہلے ستاروں اور سیاروں وغیرہ کا سراغ لگایا تھا۔ بلکہ ستارے دیکھے ہی نہیں، یہ بھی تحقیق کیا کہ ان کا رفتار نام نہاد اور لوگوں کی تخیل

پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اس موضوع پر چارے ہاں اب بھی بے شمار تصانیف اور قسم
 جنتیں موجود ہیں بلکہ بعضے اوارے تو سال کے سال نئی جنتیں چھاپتے ہیں۔
 جس میں برجِ علی، برجِ عقرب وغیرہ کے سعد و نحس کے ساتھ ساتھ خوابوں کی
 تعبیری خانہ وغیرہ درج رہتے ہیں۔ جا بجا زلچکے بھی دیئے ہوتے ہیں۔
 ان کے علاوہ ان میں صابن سازی اور بوٹ پالش بنانے اور پونڈ کریم اور قدتی
 رنگ کا خضاب وغیرہ تیار کرنے کے نسخے بھی دیئے ہوتے ہیں جس سے اس
 گمان کی ایک حد تک تردید ہو جانی چاہیئے کہ ہماری توجہ صنعتوں کی طرف نہیں ہے۔
 اور ہم محض خیالی باتیں کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں سے ہڑنی و ننگے جو لوگ یورپ جاتے رہے ہیں بس جانتے
 تھے اور پھر پھر اکے خالی ہاتھ آجاتے تھے۔ ٹرانزسٹر ریفریجریٹر، ٹیپ ریکارڈ
 وغیرہ کچھ ساتھ نہ لاتے تھے۔

اس کی توجہ تو کوئی کرنا چاہے تو یہ بھی کر سکتا ہے کہ اس زمانے میں چھری
 نہیں ہوتی تھیں کیونکہ اور کچھ ہم جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں تاویل کرنا خوب
 جانتے ہیں لیکن حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ بس کتابیں اور سفر نامے وغیرہ
 لکھتے تھے۔ مرتید احمد خاں گئے۔ کچھ تو اسلام کا مقدمہ لڑتے رہے میوہ کی
 کتاب کے جواب فراہم کرتے رہے مسلمانوں کے متعلق انگریزوں کی بدگمانیاں
 غور کرتے رہے اور واپس آئے تو سائیکس مونتھی کی داغ بیل ڈال کر جسے
 شروع کر دیتے۔ وہ تو اس زمانے کے مولوی ذرا مستعد تھے ان کی پخت اور

کفر وغیرہ کو فوراً پکڑ لیا ورنہ سید صاحب جانے کہاں تک جاتے۔ شیخ عبدالقادر
گئے تو اقبال کو خط لکھ مارا کہ سچ

کلام جو کر رہی ہیں تو میں انہیں مذاق سخن نہیں ہے

اور مخزن میں ایک مضمون بھی بلبا چوڑا لکھا کہ گھر سے نکل کے دیکھو۔

ہندوستان والو۔ ہر پھر کے پھر ذکر مولوی محبوب عالم کا آتا ہے کہ اچھے
خاصے پرانی وضع کے آدمی تھے۔ دائرہ توشیک یورپ جا کر نہ منڈوائی
اور گوشت کھانے میں بھی احتیاط کرتے رہے۔ فقط یہودیوں کی دکانوں سے
قشر یعنی حلال کھانے یا سبزیاں والیں کھاتے رہے اور ہماری طرح ٹھنڈا
پانی پیتے رہے لیکن ویسے مغرب کی ترقی سے ان کی آنکھیں چند جیا گئیں۔
اپنے ۱۹۰۰ء کے سفر نامے میں برمن کے ٹیکنیکل ائی اسکول کا ذکر کیا ہے ہم
نے بھی جا کر یہ اسکول دیکھا اگرچہ اب یہ یونیورسٹی بن گیا ہے لیکن عمارت وہی
پرانی ہے جو مولوی محبوب عالم نے دیکھی تھی۔ ذرا ان کا بیان سینے کیسے لٹو
ہوئے ان لوگوں پر کہ ہمارے کلاسیکل طرز تعلیم تک کی نبرائی کر دی۔

”جس چیز نے جرمنی کو بڑی شہرت اور عزت دی ہے وہ یہاں کا پانی لکھنی گم یعنی
ٹیکنیکل ائی اسکول ہے۔ یہ مدرسہ ایک سو ایک سال سے جاری ہے۔ میں ساڑھے
پانچ گھنٹے برابر اس عالی شان تعلیم گاہ کی مختلف منزلوں اور درجوں کا طواف کرتا رہا۔
آدھا جی نہ دیکھ سکا۔ آرگینک اور ان آرگینک کیمسٹری کے تجربے دیکھے۔ آج کل
یورپ کے تین ہزار طالب علم یہاں تعلیم پاتے ہیں سوائے ترکی کے یورپ کے
ہر ملک کے طالب علم یہاں ہیں۔ ایک عجائب خانہ میں ہر قسم کی مشین کا چھوٹا سا

نمونہ طالب علموں کے سمجھنے کے لئے رکھا ہے۔ لیکن ایک دوسری جگہ ایک مکان میں مشینوں کے ہر پرزہ کے مختلف عمل اس کے مختلف حصوں سے دسائے گئے ہیں۔ عمارات اور پلوں کے ماڈل، وصال جہازوں کے نمونے نقشہ کشی بخاری، علم رنگ کے لکچر کے کمرے اور خدا جانے اور کتنے کمرے اور لکچر روم۔ جرموں کا یہ کتنا ذرا بھی بے جا نہیں کہ اتنا بڑا مدرسہ اس فن کا دنیا میں کوئی دوسرا نہیں مسلمان بڑے نام سے اب تک یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی میں ایک وقت میں دس ہزار طالب علم پڑھتے ہیں اور مراکو کے فیض کے دارالعلوم میں بھی کئی ہزار طالب علم پڑھتے ہیں۔ مگر جیسے آدھو دیکھو تو سہی وہ کیا پڑھتے ہیں اور یہ کیا پڑھتے ہیں جن علوم کو الازہر اور فیض میں پڑھایا جاتا ہے وہ اب بوسیدہ ڈھیاں ہو چکی ہیں۔ کوئی مینڈی پڑھنے والے کو ذرا امریکہ کی مشورہ بک یونیورسٹی کی رصد گاہ میں یا گرینچ (انگلستان) کی رصد گاہ میں بے جا کر مقابلہ تو کرے کہ وہ فرضی علم ہدایت صبح ہے یا یہ عینی مشاہدہ ستاروں کا عظیم نشان دور بینوں سے۔ جو لوگ اس قسم کے مقابلوں کو پسند نہیں کرتے وہ مجھے معاف کریں۔

تو وہ طوبی و ماوتامت یار

منکر ہر کس بقدر ہمت اوست

آگے چل کر مولوی محبوب عالم درویشی سے لکھتے ہیں :-

”اس ٹکنیکل اسکول کے معائنہ کے دوران میں اس کی عظمت اور حاکمان کو دیکھ کر مجھے اپنا آپ نہایت حقیر معلوم ہوتا تھا اور مایوسی ہمت کو ایسا پست کر رہی تھی کہ دل میں خیال گزرتا تھا کہ اس قسم کی زندگی کا تو خود کشی سے خاتمہ کر دینا

چاہتے جو ایسی ناکارہ ہے۔ یہ ایک ایسے سلسلہ خیالات کا نتیجہ تھا کہ جس کے
 یہاں درج کرنے کی ضرورت نہیں لیکن یہ تو روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے کہ
 ہندوستان میں مسلمانوں کی ایسی تعلیم گاہ، ایسی دو صدیوں تک قائم نہیں ہوئی۔

صبح پوچھتے تو آج کل ہمارا ایمان بھی ڈانٹا ڈون ہو رہا ہے کچھ دن پہلے
 تک ہمارا خیال تھا کہ ہمیں سچے مسلمان بننا چاہیے۔ اور کچھ کہنے کی ضرورت
 نہیں اب ہمارا خیال ہے کہ سچے مسلمان بننے کے مدارج بھی بہت کچھ کرنا پڑے گا۔
 قوم کو صنعتی تعلیم دینی ہوگی گا رہائے بنانے ہوں گے۔ اجتماعی ناموں میں برائیوں
 اور مشینوں سے کاشت کر کے پیداوار بڑھانی پڑے گی تاکہ ملک کی معیشت مستحکم
 ہو۔ سب اچھا کھائیں، پینیں ٹیلی ویژن جناب تیشنج جی کے گھر میں کیوں ہو مرید
 سادہ کے گھر میں کیوں نہ ہو یہ دل جو آج پڑھ لکھ کو کلرک اور چرامی کی نوکری کے
 لئے مارے مارے پھرتے ہیں۔ کل میکنگ اور خریدتے ہوں گے تو اپنی خودی کو
 بھی بند کر سکیں گے۔ سیرے آپ کے محتاج نہیں ہوں گے جب آپ کے کیفیت
 آباد کا رخنہ رداں، خزانے بھر پور اور لوگ خوش باش ہوں گے چرکنا مال
 ہے جو کوئی جھسیر یا غیر جھسیر ہیٹھی نظر آپ کو دیکھ سکے۔ اس وقت
 سچے مسلمان بننے کا مزہ بھی زیادہ ہوگا۔ اس وقت تو

شب جو عتد نماز بر بندم
 چہ خورد با مداد مندر ز ندم

صاحبو! اور دن کی کیا کہیں۔ ہم نے بھی ساری عمر شاعری ہی کی بدترین

کی شاعری پر واہ واہ اور مکرر ارشاد میں عمر گزار دی۔ کیا کریں ہماری تعلیم ہی سوا
 اور میر کے کلام سے شروع ہوئی۔ چھٹی جماعت کے اردو کورس میں میر تھے۔
 خواجہ میر درد تھے۔ آتش تھے، سوز و گداز تھا۔ وہ تو خدا بھلا کرے کہ ماسٹر
 گور و بال سنگھ تھوڑی سائنس بھی پڑھا دیتے تھے جس سے کچھ تصور ایصال
 حرارت اور قوت انامیب شعری اور حیاتیات وغیرہ کا اب تک ہے اور یہ معلوم ہے
 کہ فارن ہائیٹ کیا ہوتا ہے۔ بکتاب میں پڑھے ہوتے تو۔۔۔ جھوم جھوم کر پڑھنا
 شام کو روٹیاں مانگ کر لانا۔ چھوٹے چھوٹے سکولوں پر لڑنا۔ بین میکہ نکالنا اور
 اس بات سے غافل رہنا کہ دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی ہے۔ فضا میں کیا ہو رہا
 ہے، خلا میں کیا ہو رہا ہے۔ علم الکلام کے رموز تو اسٹاڈن نے پڑھا دیئے۔ جاہر
 بن جہان کا نام نہ بتایا۔

جب پکڑا اور گلیلیو آسمان میں تھگی لگا رہے تھے۔۔۔ ہم شاعری
 کر رہے تھے۔

جب واٹ اور اسٹیفن بجاپ کو غلام بنا رہے تھے۔۔۔ شاہ نصیر ٹوہی
 کی کوشش تھی کہ کوئی قافیہ بند حق سے نہ رہ جائے۔

جب ایڈیسن اور مارکونی برق اور آواز کے دیووں کو اسیر کر رہے تھے
 ۔۔۔ ہم شعری گلدستے فتنہ اور عطر فتنہ نکال رہے تھے۔

جب رائٹ برادران کھوں سے ہوا میں اڑ رہے تھے۔۔۔ ہم اور

رجب علی بیگ سرور نقطوں کے طوطے مینا بنا رہے تھے۔ ہر مصرع سے تاریخ
 نکال رہے تھے۔

اور جب امریکہ اور روس نے آسمان کے لئے نئے چاند تیار سے بنائے ہم پرانے انٹر شٹناس اب بھی جہزیوں اور غلاموں میں اپنی قسمت کا حال دیکھ رہے ہیں۔ اب بھی ہمارے ہوٹلوں کے بالا خانے عشان معالجوں ہر پلوں سے آباد ہیں۔ جاسیوں کے حمد کو گنتی صدیاں ہوئیں۔ جاگو اور دیکھو کہ اب کس پادشاہ کی پادشاہی ہے، بیچ میں قصیدہ گو، واسوخت گو، قافیہ پیم، منشی احمد حسین قر اور منشی محمد حسین جاہ توفہ درطیں گے، لیکن مسلمانوں میں کوئی کو پرنکس، ڈاٹ، ایڈیس اور ما۔ کوئی نہ ملے گا جس نے کی شاعری کی۔ مشاعرہ برپا کیا۔ گلدستہ سخن نکالا، یا پھرتے فرقے پیدا کئے، متقدم و غیر متقدم کی بحثیں چلیں، آئین بالچھر پر فساد ہوتے ذہین اور رویت ہلاں پر آکر سفینہ کنارے لگا۔

ایسٹروم میں اور برنی میں ایسے ڈہانٹنٹل اسٹور دیکھے کہ پوری منزل کھلونے ہی کھلونے ہیں۔ ان میں گڑیاں گڈے بھی ہیں، لیکن تمام مشینوں کے ماڈل بھی دیکھے جن سے پتہ چلے کہ پسٹن کیا ہوتا ہے، گیسر کیسے کام کرتے ہیں، ابر کیا چیرہ ہے، ہوا کیسے ہے۔ یہی التزام یہاں کی کتابوں اور کورسوں میں ہے۔ یاد رہا، کیا ہیں یہ قصے جن کو سینے سے لگائے پھرتے ہو۔ — فارس کے شہزادوں کی کمائیاں ہیں، جہان عالم اور بدو منیر کو کب تک روو گے۔ میر کی بے زری کا نہ کر گلہ فانی، رکھ تسلی کہ یوں مقدر تھا کب تک ہماری نئی نسل کے کورسوں میں رہے گی۔ سکندر تو جب دنیا

سے گیا تب خالی ہاتھ تھا تم تو دنیا میں خالی ہاتھ ہو۔ غالب جیسے بھی ہستی کے قریب میں نہیں آئے۔ عالم کو حلقہ دم خیال جانتے رہے۔ اور ہم نے دنیا بھر کے علوم اس شاعر کے دیرانی میں ڈانٹ ڈنڈے کیے۔ جیسے آریہ سماجی لوگ جیٹ ہوائی جہازوں کو دیداروں میں تلاش کر کے لاتے ہیں۔

اے صاحبو! دن بھر مصاحبوں کے جلو میں بیٹھے ناؤ نوش کرنے والے مجرا دیکھنے والے اور مشاعرے کرنے والے کچھ غدر کے ساتھ کچھ پھلی صدی کے ساتھ گئے۔ کچھ پہلی جنگ میں قنا ہوئے کچھ دوسری جنگ کے ساتھ ختم ہوئے اور ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد تو ان کی ایک یاد سی باقی ہے، سو وہ بھی کیا ہے اچھا ہے یہ لوگ ختم ہوئے۔ اچھا ہے ہم ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی مار گئے ورنہ یہ بھی نہ ہوئے جو ہیں۔ مولوی محبوب عالم نے اپنے تاثرات اس وقت رقم کئے جو سرد خانوی راج کا آفتاب نصف سنہا پر تھا۔ آزادی کا تصور بھی نہ تھا ان کو دو سو سال تک کچھ ہوتا نظر نہ آیا۔ بھرتے، یوس نہیں، دست دہانہ بھی مضبوط رکھتے ہیں، موقع ملے تو ذہن کی جوت میں بھی کم نہیں۔ اک ذرا یہ شاعری اور قناعت اور سوز و گداز اور وحدت الوجود اور مراعات الفیہ اور رویت ہلال وغیرہ کے مباحث نہ ہوں تو ————— !

ہالینڈ

۲۷ اکتوبر تا ۵ نومبر ۱۹۶۷ء

HOTEL ALBERS



کوہ (ہوٹل) ابرز کی چوٹی پر

از ایسٹرڈم

خدمتِ جناب معالیٰ القاب قدرت اللہ شہاب سابق سفیر متعینہ البند

خیریت موجود خیریت مطلوب !

جناب والا! کیا یہی ایسٹرڈم ہے جہاں رہ میراں وغیرہ پیدا ہوئے تھے؟
ان لوگوں کو کوئی اور جگہ پیدا ہونے کو نہ ملی ہیں بھٹیلا خانے میں بستر پر اکڑوں
بیٹھے ہم یہ سطور رقم کر رہے ہیں اس سے تو کراچی کے ٹرام پٹے والے ہوٹل
ہزار درجہ اچھے جن میں مجرب سنیا سی نسوں والے سلیم اور قسمت کا کچا چھٹا
بتانے اور تقدیر گاڑنے والے عامل کامل رہتے ہیں۔ وہ پردیس رحمن کے
کمرؤں کے باہر لال آنکھوں اور سینگوں والے خوفناک جنوں، کھوپڑیوں اور
سفلی جانوروں کی تصویروں کے پھٹے لگے رہتے ہیں۔ ہم سیدھے مغربی برہن سے
آتے ہیں۔ یوں لگتا ہے۔ جیسے ٹوکیو سے میرپور خاص کی گلیوں میں پہنچ گئے ہوں
وہاں کی سڑکیں اسی صاف اور مجلات کہ ہم تو آئینہ دیکھتے ہی نہیں تھے بس سڑک

میں اپنا منہ دیکھ لیتے تھے۔ انتظام ہمارا ایک ایسے شاندار ہوٹل میں تھا جس کے باہر شاندار وردیوں والے چوبدار بکوس باندھے کھڑے رہتے تھے۔ بڑھ کر دروازہ کھولتے۔ بات بات پر اور بعض اوقات ہلا بات کے بھی سلیوٹ کرتے۔ ہمارا سوٹ کیس اور ہمارے ناز اٹھاتے بغیرم بجاتے ایسی ٹھاٹ کے چاکش تھے کہ ہمارا خود انھیں سلام کرنے کو بھی پابھتا تھا۔ مگرہ قالین والا، مکلف۔ ایک طرف کو صوف پڑا ہے، مکرے کے ساتھ ہی اپنا ذاتی غسل خانہ، چاہے صبح سے شام تک اس کے اندر بیٹھے اخبار پڑھتے رہو۔ چاہے بے ثباتی دنیا پر غور کرتے رہو۔ کوئی بے چارہ دست کرنے والا نہیں کیونکہ مکرے کے باہر تختی لٹکا سکتے ہیں *DON'T DISTURB* یعنی خبردار اگر کوئی اندر آیا۔ دروازہ ایسا کہ ذرا سا کواڑ آپ نے بھیڑا اور خود بخود تالہ لگ گیا۔ یہاں کے دروازے کی طرح نہیں کہ اتنی بڑی چابی سے بھی آسانی سے بند نہیں ہوتا۔ لفٹ موجود ہے۔ اپنی منزل پر نہایت جھلمل مھمل کرتا ناشتے کا کمرہ بیرے سفید براق یونیفارم زیب تن کئے ہوئے (جیسی ہمیں نصیب نہ ہوئی) بات بات پر بلایں لے رہے ہیں۔ فیس نمز میں سر کر رہے ہیں۔ اردو تو خیر نہیں باقی دنیا کی ہر مہذب زبان میں آپ کو ممکن رکھا رہے ہیں۔ یہ بڑا شاندار لاؤنج جس میں ہم اپنی ترجمان مس فرہنگ کا کو بٹھاتے تھے۔ یہ بی بی فرہنگ کا ہمارے یہاں کے میزبانوں نے ہمارے ساتھ لگا دی تھی۔ کسی کالج میں پڑھتی ہے۔ ہمیں ہوائی اڈے پر لینے آئی۔ چھوڑنے آئی۔ ہمہ وقت ساتھ رہی۔ ٹیکسی کا کرایہ بھی ہمارے

میزبانوں کے حساب میں خود دیتی تھی۔ البتہ اس کو دوپہر کا کھانا ہم اپنے پتے سے کھلاتے تھے۔ خیر اس کا طالع نہیں کیونکہ ہم تو اس کا روٹی کپڑے پاندان وغیرہ کا پورا خرچ اٹھانے کو بھی تیار ہو جاتے۔ ویسے اس کو پانچ کھانے کا نیتجویہ ہوا کہ برلن سے رخصتی کے وقت ہوٹل کا بل دینے کے بعد ہمارے پاس بیروں کی فوج خفر موح کو خشیش دینے اور ایئر پورٹ ٹیکس ادا کرنے تک کا پیسہ نہ تھا۔ ہم نے وہ دو تین پونڈ نوڈل سے جو لندن والے لادوس میں سے آؤ مٹر کھا کھا کر اور پیدل چل چل کر بجائے تھے۔ گرا یہ برلن والے ہوٹل کا کچھ زیادہ نہ تھا۔ سولہ مارک روزانہ تھا۔ یعنی چار ڈالر اور یاد رہے کہ غسل خانے سمیت جس میں خوشبودار صابن کی ٹیکہ اور چار تویلے ہر روز بدلے جاتے تھے۔ ساڑھے تین مارک کا ناشتہ۔ ویسے ہم ریٹس ابن میٹس ایک اڈا بھی ساتھ لکھتے تھے۔ جس کے کچھ پیسے مزید ہوتے تھے۔ اس پر پندرہ فی صدی سر دس چارج۔ باوجود اس تھاٹھ باٹھ کے ہمارے روزینے میں سے جو ۴ مارک تھا۔ ہمارے کھانے (اور کھلانے) اور مشرقی برلن دیکھنے کے لیے کوئی بیس مارک رہ جاتے تھے۔ یہاں ہمارا روزینہ بتیس گڈر، ہوٹل سولہ گڈر۔ پندرہ فی صدی اس کے علاوہ کھانے کی ابھی نوبت نہیں آئی بس ات بکٹ کھا کر باقی پی لیا تھا۔ یہی میل دنمار رہے تو یہاں بسکٹوں اور سینڈویچ وغیرہ پر گزر ہوگی۔ کھانا کھانے کی نوبت اگلی منزل پر ہی آئے گی۔

اس ہوٹل کا انتظام ہماری ایئر لائن والوں نے (ہمارے خرچ پر) کیا تھا ایئر ٹرمینل سے کوئی آدھی فرلانگ دور تھا، لیکن ٹیکسی والے نے کہا بھی ڈھائی

گلدڑ (ایک پونڈ میں دس گلدڑ سے کچھ کم ہوتے ہیں) ہو گئے۔ کراچی میں اتنے
 فاصلے کے پچاس پیسے ہوتے۔ ہمارے پاس خوردہ نہیں تھا۔ ہم نے تین ڈیسے
 اس نے جھٹ جیب میں ڈال لئے اور فرمایا : IS IT O.K.? - یعنی آدھا گلدڑ
 بخشش تم کو کافی سمجھتے ہو یا اور دو گئے ؟ اس سے بھگت کر اور سڑک سے خود
 ہی سوٹ کیس اٹھا کر اس دروازے پر پہنچے جس پر چھوٹی سی تختی 'ابرز ہوٹل'
 کی لگی تھی۔ تو ہمارے گھنٹی بجانے پر اندر کھٹکا سا ہوا اور دروازہ کھل گیا۔ ہمارے
 ہوش بوا ہو گئے۔ کیونکہ اندر کمرہ یا لابی یا دفتر نہیں تھا بلکہ میسرھیوں کا ایک
 لابی تھا ہی سلسلہ حد نظر تک چلا گیا تھا اور تقریباً عمودی سلسلہ نوٹے کا نہیں تو ۸۵
 درجہ کا ضرور بنتا ہوگا۔ عرض میسرھی کا تقریباً ۴۰ رانچ 'پاؤں کی اگلی انگلیاں رکھ کر
 چڑھو پورا پر رکھنے کی گنجائش نہیں۔ ہم نوٹے کو تھے کہ اوپر اس کو میں کی
 منڈیر پر سے آواز آئی : گڈ آفٹر نوں - دروازہ بند کر دینا : یہ وہ بڑیا تھیں
 جو اس کی مالک 'بیرا' خانساں بھاڑو بہار دوالی غرضیکہ سب کچھ تھیں —
 دروازے کی چٹنی کے ساتھ انھوں نے اودا آن کی ایک رسی باندھ رکھی تھی۔
 جو دیوار کے ساتھ ساتھ کنڈیوں میں سے ہوتی ہوئی اوپر ان کے کمرے
 تک چلی گئی تھی۔ قسمت کا مارا مسافر باہر سے گھنٹی بجاتا ہے تو وہیں بیٹھے
 اس رسی کو ایک زور کا جھٹکا دیتی ہیں اور دروازہ کھٹ سے کھل جاتا ہے۔
 پھر تاکید کرتی ہیں کہ بند کر کے آنا۔ ہمارے کمرے تک آنے کے لئے ۷۵
 میسرھیاں پڑتی ہیں۔ ہوٹل ابرز سے شروع میں ہم سمجھتے تھے کہ یہ ابرز کسی کا نام
 ہوگا۔ کوہ ابرز کی نسبت کی طرف دھیان نہ گیا تھا۔ کمرے کے ساتھ غسل خانہ

اور دوسری حاجات ضروریہ غیر ضروریہ کا کیا سوال؟ اس سردی میں کمرہ گرم رکھنے تک کا انتظام نہیں۔ ایک پرانا ہیٹر اٹھا کر لائیں جو بابا آدم نہیں تو ریفریجریٹر صاحب کے استعمال میں ضرور رہا ہوگا۔ فرمایا بہت سردی لگے تو اسے جلا لیں۔ لیکن بجلی کا سوراخ ایک ہی ہے اسے لگاؤ تو پڑھنے کا لیمپ بند کرو۔ دوسری عیاشی نہیں کر سکتے۔

ناشتے کے لئے پوچھا کہ کئے بجے کرتے ہو۔ ہم ذرا دیر خیز ہیں لیکن یہاں صبح بہت جلد ہی ہوتی ہے لہذا کہا۔ یہی کوئی آٹھ بجے۔ فرمایا۔ یہ تو بہت جلد ہی ہوا۔ سردی ہے میں ذرا دیر سے اٹھتی ہوں نو بجے کرو تو اچھا ہے جب معلوم ہوا کہ ہم پاکستان کے ہیں تو بولیں۔ پاکستان کے لوگ اس ہوٹل کو بہت پسند کرتے ہیں۔ ایک مسٹر خان ہیں تم جانتے ہو گے وہ تو ہر سال یہیں آکر ٹھہرتے ہیں۔

یہ وہ شہر ہے جس میں آپ تین سال تک ہر ایک سیلفی رہے۔ سنا ہے یہاں سفارت خانہ اور سفیر کبیر کا گھر ایک محل ہے جو جاری حکومت نے اچھے دنوں میں خرید لیا تھا۔ آپ کے اخلاق کو یہاں پر نظر کرتے ہوئے کچھ جب نہ تھا کہ ہم بھی اس کے کسی کونے میں فروکش ہو جاتے اور ہفتہ بھر آپ کی روٹیاں توڑتے۔ آخر پاکستان سے جانے والے اتنے لوگ ہی کرتے رہے ہیں۔ بعضوں کو تو سنا ہے کہ آپ نے پُر زور اصرار کر کے اور پتے سے کراہ دے کر وطن واپس جانے پر آمادہ کیا تھا۔ ہم چھ سال قبل بھی کچھ دن اس شہر میں گزار گئے ہیں۔ ہوٹل اس وقت بھی کچھ ایسا اچھا نہ تھا۔ لیکن کم از کم اس کا دروازہ اور دائیں کی رستی سے نہ دکھتا تھا۔

ہوٹل بالکل نیشنل میوزیم کے ساتھ والی گلی میں ہے۔ یہ میوزیم انیسویں صدی کے وسط میں بنا تھا۔ گویا جہاز اس ہوٹل کے مقابلے میں اس کی عمر عجب جھڑاٹھ دو جانتی چاہیے۔ آج ہمارا گزرا میسٹر ڈم ٹھن کے سامنے سے بھی ہوا۔ یہ ہمارے ہوٹل کے مقابلے میں بہتر معلوم ہوا لیکن ہم اپنا پانچ دن کا الاؤنس جمع کریں، تو وہاں ایک شب قیام کر سکتے ہیں یہ تو کر لیں لیکن یہ باقی کی چار راتیں کہاں گزاریں
اے عجب دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں



ہالینڈ ہم کو پسند آیا

ایسٹرڈم تو جیسا ہے سو ہے۔ نہروں کا ایک جال ہے ہمارا خیال تھا نہروں کی یہ اسلیم خوبصورتی کے لئے رکھی گئی ہے۔ پتہ چلا کہ یہ بات نہیں۔ پہلے چھوٹا سا شہر تھا۔ بیرونی حملے کے ڈر سے نہر کھودی گئی۔ پل تھے جو اٹھائے جاسکتے تھے۔ آبادی بڑھی تو نہر کے دوسرے کنارے کے ساتھ ساتھ حویلیاں اور مکان بن گئے۔ اس کی حفاظت کے لئے چلی نہر کے متوازی نہر کا دوسرا حصار کھینچا گیا۔ پھر تیسرا۔ پھر چوتھا۔ پانچواں۔ چھٹا۔ ساتواں۔ آٹھواں وغیرہ، اوریوں جس طرح درخت کے تنے کے حلقے دیکھ کر آپ اس کی عمر کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ایسٹرڈم کا نقشہ دیکھ کر معلوم ہو سکتا ہے کہ کتنی نسلیں اور کتنی صدیاں اس شہر پر سے گزری ہیں۔ گول مول بات ہم اس لئے بھی کر رہے ہیں کہ جس کا گذر اس شہر کا سال تعمیر نہروں اور پلوں کی صحیح تعداد وغیرہ لکھے تھے ہم سے لکھو گیا ہے۔

ڈچ لوگ اور ان کا شہر ہمیں پسند آتے۔ یورپ کے بعض دوسرے ملکوں کی طرح ان لوگوں کو صفائی کا جنون نہیں ہے۔ آرٹسٹ لوگ ہیں۔ لندن میں تو جگہ جگہ



ایستاد کاشانی یوزیم

لکھا ہے کہ اگر شرک پر تھوکا یا کاغذ کا کوئی پرزہ پھینکا تو ہم سے بڑا کوئی نہ ہوگا۔ اینڈ
 میں اس قسم کی کوئی ناروا پابندی نہیں ہے، کئی بار تو یہ خوش گوار احساس ہوتا تھا کہ ہم
 اپنے ہی ملک میں ہیں، کوئی چیز اجنبی نہیں۔ بادشہ ہے تو کچر ہے۔ کار بھی چسپ چسپ
 چھینے اڑاتی گزر گئی ہے۔ کوئی مکان تعمیر ہو رہا ہے تو جرمنی یا انگلستان میں اس کے
 گرد پردہ کھینچا پڑتا ہے۔ ہمارے ملک کی طرح یہ لطف نہیں کہ آپ فٹ پاتھ سے گزر
 رہے ہیں اور اوپر سے سینٹ اور ریت نیچے گر رہے ہیں۔ انٹیں آ رہی ہیں۔ یہاں
 ایک فٹ پاتھ سے گزرتے ہوئے ہم پر اوپر سے گارا گرا تو برج یہ ہے کہ اس میں سے
 اپنے وطن کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو آئی، ملک سے دوری کا غم مٹ گیا، کاغذ
 چاک کر کے اس کے پرزے بھی ہم نے جہاں چاہا پھینکے، کسی کے ابد پر بل نہ آئے۔
 شرک کو بھی ہم نے جاوہیجا کر اس کیا۔ جرمنی میں ہم لالہ جی پرزک کر پنا قیمتی وقت
 ضائع کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ بہت سے ہوٹلوں اور طعام خانوں میں بھی صفائی
 کا معیار ہمارے ملک کے ایرانی ہوٹلوں کا تھا، اس سے کم نہیں تھا۔ مانگنے والے بھی
 اتنے توخیر نہیں تھے جتنے صدر میں ملتے ہیں تاہم کہیں کہیں بڑے۔ شرک پر ایک ٹیٹلا سا
 کھڑا کر رکھا ہے جس میں گراموفون لگا ہے جو بلند آواز سے پُرسوز گانا گا کر راہ گروں کے
 دل میں جذبہ ترحم پیدا کر رہا ہے اور ایک شخص اپنا پیالہ لئے ہوئے اس میں ککے چمکاتا
 لوگوں کا راستہ روک رہا ہے۔ البتہ بیس ٹرا میں ان خالوں نے نئی بنا دی ہیں۔ ریمران
 کے عہد کی نہیں رکھیں۔ یا پھر تعلیم کا معیار اچھا ہے۔ کتابیں خوبصورت چھپتی ہیں چیری
 خاص ہستی ہیں، لوگ بااخلاق ہیں۔ نائی بھی اچھے ہیں۔ ہم نے یہاں اکربال کٹائے، لندن
 والے نائی سے تو بہتر نکلا۔ پیسے بھی کم لئے، ٹینک دیو بھی بڑے پاک سے کہا۔

ان تو کئی تھاکا میٹرڈم تو جیسا ہے سو ہے۔ ڈیفٹ اور لیڈن دونوں کی خبر میری
 نے جاری ہوئی۔ ڈیفٹ تو ہم کام سے گئے تھے، ایک صاحب سے ملاقات کی تھی
 تھی، اس کے بعد ہم نے از خود ٹاؤن ہال کے گرد کے حصے کا چکر لگایا۔ ڈیفٹ میں
 ایک تو چینی مٹی کی صنعت پرانی ہے۔ ظروف پر ٹائلوں پر نئی نقش کاری یہاں کا خاص
 فن ہے۔ وہی رنگ کہ مٹاس کی خصوصیت ہے، ڈیفٹ میں برتا جاتا ہے اس کے
 علاوہ کھڑی کے جوئے زیادہ تر اب سیاحوں کی تفریح طبع کے لئے بنتے ہیں لیکن ہم
 نے ایک شخص کو پہنے ہوئے بھی دیکھا۔ معلوم ہوا سردیوں میں آرام رہتا ہے۔ لیڈن
 میں ہم کو علم کا شوق سے گیا تھا۔ کچھ ہمارا خیال تھا (جو غلط نکلا) کہ انساٹیکلو پیڈیا آف
 اسلام کی ترتیب و تدوین بھی لیڈن ہی میں ہوتی ہے۔ ہمیں بھی کچھ معلومات اسلام کی ہیں
 ہمارا ارادہ تھا ان لوگوں کو بتا کر گئے لیکن پتہ چلا کہ یہاں کے ایک ادارے کو فقط
 اس کی اشاعت میں دخل ہے۔ لائبریری کا اور نیشنل شعبہ دیکھنے کا بھی ہم نے حاصل تمام
 کیا تھا۔ ہمارا خیال تھا وہاں جا بجا لوگ جتے پھرتے ڈچ بے میں عربی فارسی بولتے نظر
 آتے گئے، لیکن ایسا نہ ہوا۔ لائبریری صاحب کچھ بھلا سا نام تھا ان کا، شاید عربی جانتے
 تھے۔ بہر حال کتابوں کے نام پڑھ جلتے تھے۔ ہم نے اردو کی کتابیں دیکھنے کی خواہش
 کی۔ فقط اسکو کی بھی ہوئی اردو روسی لغت نکلی اور کچھ بھی نہیں۔ اس سے زیادہ کتابیں
 تو وہاں گورنمنٹ کی تھیں، گورنمنٹ کے متعلق بھی تھیں۔ ان عربی کا ذخیرہ کچھ ہے۔ یا پھر
 چینی جاپانی کا۔ اور انڈونیشیائی کا۔ ہم کتب خانے کی کنگری سے ضرور متاثر ہوئے۔
 اور اس میں شک نہیں کہ ڈچ زبان کی پرانی کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے۔ جرمنی اور انگریز
 کی کتابیں بھی خاصی ہیں۔ ہمارا شوق الف لیلا اور اس کے تراجم ہیں، سو چند نسخے دیکھے۔

جو اور جگہ نہ ملے تھے۔ ان سے قطع نظر جیسے گئے ویسے ہی ہر پھر کے آگئے۔
 لیکن جس ڈیفٹ اور لیڈن کی گلیوں کو چوں نے بہت متاثر کیا۔ خوبصورت ٹائلوں
 والے مکانات۔ نر لیڈن کے اندر سے بھی گزرتی ہے۔ سیر کرتے ہم پرانے ٹاؤن ہال
 کی طرف جانکھے۔ سڑک کے سرے پر ایک پول پلکی بھی تھی۔ مکانوں کا انداز وہی ترحویں
 اشعار ہویں صدی کا۔ سکائی سکرپروں یعنی فلک نامہ مکانوں کی بدعت فقط راتروم میں
 دیکھی۔ کیونکہ وہ شہر عالمی جنگ کی بیماری میں بے کا ڈھیر رہ گیا تھا، نئی تعمیرات بند مہیب
 اور چوکور ہیں۔ ایسٹروم بھی پرانے تاجروں اور رئیسوں کی حویلیوں کا شہر ہے۔ لیکن
 لیڈن اور ڈیفٹ کے ٹیکس پھتوں اور گیلری والے مکانات تو اپنی الگ ہی ولا ڈیزی
 رکھتے ہیں۔ غاص سے بے نیاز گاؤں کی اگھر دو شیزاؤں کی طرح۔

ایسٹروم کا مشہور ٹوپن میوزیم جس میں مختلف استوائی ملکوں کے رہن مہن کا
 انداز دکھایا گیا ہے۔ ان کے ہوسات۔ گھر۔ گھروں کا سامان، زیور، ظروف بلبے گتے
 اوضاع اطوار۔ یہ ہم نے آنے کے پہلے ہی روز دیکھ لیا تھا۔ اتھولوجیکل میوزیم ہمارا
 خاص شوق ہیں۔ برلن کے فوکر کنڈے، یعنی معاشرتی میوزیم کا حال ہم نے مولوی محبوب نام
 کے سفر نامے میں پڑھا تھا۔ کشاں کشاں پنچے۔ افریقی اور چینی جاپانی شے تو دیکھے،
 لیکن وہ شعبہ جو اس بر عظیم سے تعلق رکھتا ہے۔ مرمت کے لئے بند تھا، سخت
 مایوسی جوئی۔ عمارت وہی ہے جو اس صدی کے آغاز میں تھی۔ مولوی محبوب عالم نے لکھا
 ہے کہ تپہ پنجاب کے متعلق ذخیرہ کافی نہ تھا۔ گو لاہور کے کیر سے بازار کی آٹھ آنے
 والی ایک چار پائی بھی پڑی تھی لیکن اس سے لوگ یہی نتیجہ نکالتے ہوں گے کہ ہندوستانی

صرف ایسی ہی چار پائیاں استعمال کرتے ہیں۔ ایک صادق الاخبار بہادر پور کا نمونہ سیالکوٹی کاغذ پر چھپا ہوا رکھا تھا۔ میں نے وہاں رکھنے کے لئے پسیدہ اخبار اور انتخاب لاہور کے نمونے مع ایک لکھے ہوئے مراسلہ کے جو اتفاقاً میرے پاس تھا۔ عجائب گاہ کے اعلیٰ افسر کے پاس بھجوا دیئے جس نے مجھے بعد میں شکریے کا خط بھیجا۔

جس سے یہ میوزیم پورا نہ دیکھ پانے کی کچھ غلامی ایسٹریڈم کے ٹروپن میوزیم کو دیکھ کر ہو گئی۔ افریقہ اور انڈونیشیا کے شعبے خاصے بڑے ہیں اور ایشیا کے بعد اور ملکوں کے بھی جن کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ہمیں تو بہت اور سہانگی کو جھٹکنے میں ابھی کتنے قرن لگیں گے۔ ایک جگہ بتوں کا خیمہ بھی تھا ہے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ بیسویں صدی کی معاشرت ہے۔ ایک جگہ ایک پاستانی عورت ٹھٹھے کے سیدھے برقعے میں کھڑی نظر آئی۔ بعض اور اسلامی ملکوں کے برقعے تو اور بھی کمال ہیں۔ لیکن پاکستان کے شعبے میں ایک عزم کو ریشمی غرارہ چنے اور برس اٹھائے بھی دکھایا گیا ہے۔ ایک کونے میں ایک شعبہ اسلام کا ہے۔ مسلمانوں کو نماز پڑھتے دکھایا گیا ہے۔ خانہ کعبہ اور حج کی رسوم بھی دکھائی گئی ہیں۔ اس شعبے میں مختلف مسجدوں کے نمونے بھی رکھے گئے ہیں۔ اور ایک طرف قرآن مجید اور اس کے تراجم مختلف زبانوں میں۔ اچھا اثر آفریں شعبہ ہے۔ براہ اور انڈونیشیا وغیرہ کے تو پورے گھر اور دکانیں ہیں۔ ان دکانوں میں نون تیل پورا اصلی ساز و سامان بھرا ہے۔ بس اندر دکاندار مصنوعی ہے۔

ہالینڈ کے راستوں میں تنہا

مجھے۔ آج پھر راتیں وہاں گزارنے کے بعد ہم ہوٹل البرز سے چلے آئے اور وہ بند ہو گیا۔ کم از کم عارضی طور پر کیونکہ اس ہوٹل میں ہم تنہا مسافر تھے۔ ناشتے کی واحد میز پر صرف ہمارے لئے ناشتے کا انتظام ہوتا تھا۔ فقط ہمارا بستر بچتا تھا۔ مسز البرز بازار سے فقط دو انڈے اور ایک ڈبل روٹی لاتی تھیں۔ ایک ہمارے لئے، ایک اپنے لئے۔ بلکہ ہمارا خیال ہے بازار جاتی ہی نہیں تھیں۔ کیونکہ ادوان کی رستی کے ساتھ ساتھ سیڑھیوں میں ہم نے ایک اور تاریکی بندھی دیکھی جس کے سرے پر چھینکا ٹکا ہوا تھا۔ انڈے ڈبل روٹی والا صبح صبح آکر گھنٹی بجاتا تھا۔ مسز البرز، ادوان کو جھٹک دیتیں اور دروازہ کھل جاتا وہ چھینکے میں سامان خورو نوش رکھ کر اور گڈ مارنگ کا آوازہ بلند کر کے دروازہ بند کر دیتا۔ اور یوں یہ ہوٹل چل رہا تھا۔ اور ہم اس میں چل رہے تھے۔ اور گریہ مع ۱۵ فیصدی سروس کے دے رہے تھے۔ قاعدے سے یہ ۱۵ فیصدی سروس ہمارا حق بنتا تھا کیونکہ ہوٹل کے مسافر دھو دھ ہم خود ہی تھے۔ کامان



منظر بھی حسین، چہرے بھی حسین
ایسے کہ کبھی دیکھے بھی نہیں
پرواپنے لئے تو شہر نہ بن
آتی ہے یوں، جاتی ہے یوں



رُکے کی نہیں جا۔ اُٹھ ہی چکو
 کسی اور نگر چلیں اُجسبیلو
 سینے میں لے سب سے کی دُکھن
 آتی ہے یوں اجاتی ہے پرن

اوپر چڑھانا اتارنا ہمارا کام تھا۔ دروازہ کھولتے بند کرتے ہم خود تھے۔ کوئی قون آتا تھا تو دوڑے دوڑے کاریڈور میں ہم جاتے تھے۔ صابون ہم اپنا برتے تھے۔ جوتے ہم اپنے خود پالش کرتے تھے۔ رات کو اس ہوٹل میں عجیب سناٹا ہوتا تھا۔ اس کی قیسری منزل پر ڈیوڑھی والے کمرے میں ہم نیچے نہ جانے کہاں مسز ابرزہ۔ انگریزی بولتی ضرور تھیں لیکن زبان میرا درکام میرا کی طرح خود ہی سمجھتی ہوں گی۔ ہماری خدمت نہ کر سکنے کا انھیں ملال تھا کیونکہ بقول ان کے ان کی صحت ابھی نہ رہتی تھی۔ حالانکہ عمر ان کی ۶۷ سال سے زیادہ نہ تھی۔ ہمیں ان کا ہوٹل چھوڑنے کا حقد ضرور ہوا۔ لیکن یہ خوشی ہے کہ بیچاری کو اب کسی مسافر کے لئے ناشتے وغیرہ کا تردد نہ کرنا پڑے گا۔ کل صبح آرام سے پاؤں پسر کے سوئیں گی۔ یہ امکان کم معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شامت کا مارا مسافر وہاں آنکلے۔ ایک ذریعہ شخص آیا ضرور تھا۔ کمرے دیکھنے کے بعد بولا۔ اچھا میں ابھی آیا۔ لیکن ے

جو مجھے دیکھنے کو آتا ہے

پھر مجھے دیکھنے نہیں آتا

اب ہم میوزیم ہوٹل میں ہیں۔ جو بالکل ساتھ والی گلی میں ہے۔ مسز ابرزہ سے ہم نے جھوٹ بولا ہے کہ ہم دوسرے شہر۔ ہیگ میں جا رہے ہیں۔ کیونکہ اب ہمارا کام وہاں ہے، ایسٹروڈم میں نہیں ہے۔ ہم سعدی کے چیلے ہیں۔ دروغ مصلحت آمیز کے تانکے ہیں۔ ہمارا یہ اچھا سات ستھرا کمرہ ہے۔ میڑھیاں بھی ہوٹل ابرزہ کے مقابلے میں آدھی۔ ہو گا عالم بھی نہیں ہے کیونکہ نیچے سامان اٹھانے کو



شہر لیڈن کی ایک جگہ

ہری جلیٹ والے دربان، کونٹر پر دوڑ لیاں۔ ایک طرف کوناشے کا کمرہ اور دوسری
 جس میں گفت و رویوں والے بیئر ترت پھرت کرتے نظر آ رہے ہیں۔ مسافروں کی ریل پل۔
 مرکزی سٹینک بھی ہے۔ مسز ابر نے جہیں بیٹھ کر جو آگے دیا تھا اس میں سے
 ہوا تو آتی تھی۔ گرمی ہم نے نہ دیکھی۔ اسے کئی بار اٹھا کر ہم نے گود میں بھی رکھا
 کچھ فائدہ نہ ہوا۔ شب بھر ٹھٹھرتے تھے۔ تو ایسے کی جگہ چار گرے کا ایک رومال
 تھا اور اس چار گرہ پکڑے کی قسمت غالب یہ تھی کہ چھ دن میں تو بدن نہیں گیا۔ داس
 بیسن میں ڈاٹ تو لگتی ہی نہیں تھی۔ دو ٹکڑے ہو گئی تھی اور گرم پانی کی ٹونٹی کھولنے
 تو کھولتے چلے جائے۔ دو تین منٹ کے بعد ٹپکا شروع ہوتا تھا۔ غائب پانی بھی
 سیدھا پائپ سے نہیں بلکہ سیڑھیاں چڑھ کر پینٹا کا پینٹا آتا تھا لیکن ٹھنڈا پانی تو
 خوب فوارے کی طرح آتا تھا۔ اس میوزیم ہوٹل کے کمرے کی دیوار کو ہم نے ٹھوکا دیا۔
 ٹھوس دیواریں تھیں بلکہ ایک پر تو لکڑی کے خوبصورت تختے بھی لگے ہیں۔ ہوٹل ابرز
 میں ہمارے کمرے کی دیواریں تحقیق نہ ہوا کہ کس مسالے کی تھیں۔ انگلی سے دباؤ
 تو اتنی دیوار اندر کو دب جاتی تھی۔ ہمارے خیال ہے مونا کاغذ تھا اس کے پیچھے خلا تھا
 اور خلا کے پیچھے جانے لیا۔ کچھ نہ کچھ تو ہو گا۔ خلا کی کھوج لگانے کا جنوں روسیوں
 کو ہے۔ جہیں نہیں ہے۔

مصروفیت سینے کو صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے۔ عمر یونی تمام ہوتی ہے
 اور ہمارا کام تمام کرتی ہے۔ ہر روز ایک نئی منزل سر پر کھڑی مٹی ہے کل جمع
 ۹ بجے ایک صاحب سے ڈلفٹ میں ملنا تھا۔ ایسٹر ٹوم سے گاڑی ۵۲-۷ پر چلتی

ہے اور ۵۴۔ ۸ پر پہنچا پاتا ہے۔ ۵۴۔ ۷ پر چلنے کے لئے اسٹیشن پر پندرہ بیس منٹ پہلے پہنچو۔ ٹکٹ لو اور پٹ فارم تلاش کرو۔ اس کے لئے آدھ میل دُور جا کر سولہ نمبر کی ٹرام پکڑنی چاہیے۔ اس کے لئے گھر سے کم از کم سات بجے چلو۔ اور چونکہ فیش کا انتظام صفائی بھی ضروری ہے۔ یعنی شیو کرو۔ منہ اتھو دھوؤ۔ کپڑے پہنو تو چھبے اٹھو۔ یعنی فور کے تڑکے۔ ہم ہویشیاں یہ کیا جانیں؟ خیر مسز لبرز سے نام پس مانگا۔ ڈلفٹ گئے۔ انھوں نے پہلے ہی فون کر رکھے تھے ایک اور شہر میں رائڈوم میں۔ نیا ٹکٹ لیا اور وہاں بھی جا اترے۔ وہاں کے کام جھگڑتے تو چھر بیگ آئے۔ کیونکہ بیگ کے پاس ایک قصبہ ہے جہاں وزارت خارجہ کے دفاتر ہیں اور وزارت خارجہ کے ایک افسر ہماری ملاقات کا اشتیاق رکھتے تھے بشرطیکہ ہم ان کے پاس پہنچیں۔ یہ تجربہ ہم کبھی نہ بھولیں گے۔ یہاں کے لوگ بے حد بااخلاق ہیں۔ اگر ان کو کوئی راستہ معلوم نہیں تو ہمیں ٹکہ سا جواب نہ دیں گے بلکہ کچھ نہ کچھ بتائیں گے ضرور۔ کوئی نہ کوئی ٹرام کا نمبر بتا دیں گے۔ بس نمبر بتا دیں گے۔ یا انگلی سے کسی طرف اشارہ کر دیں گے۔ چنانچہ کسی نے ہم سے کہا۔ دس نمبر ٹرام لو۔ فور برگ کے سٹیشن پر پہنچے گی۔ وہاں کسی سے بھی پوچھ لینا۔ وہاں اترے اور کسی کو پتے کی چٹ دکھائی تو بہت سے لوگ جمع ہو گئے اور بیک وقت چاروں سمتوں میں اشارے کرنے لگے آخر ۲۲ نمبر کی بس لی۔ اس کے ڈرائیور نے ایک جگہ اتار دیا اور کہا۔ یہاں کسی سے بھی پوچھ لینا۔ اس سڑک پر دُور دُور تک آدم نہ آدم زاد، اور بارش۔ اور سردی اور مہولے جھونکے۔ کوئی نئی بستی تھی۔ ایک لڑکا ایک مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ ہم وگ بھرتے وہاں ابھی پہنچے نہ تھے کہ سائیکل پر چڑھ کر ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔ ایک اور صاحب

کی طرف ہم بھاگے۔ دو چار اٹھ لب بام رہ گیا تھا کہ وہ ایک بس میں سوار ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ایک بھلے مانس کو چوراہے میں کاغذ دکھایا۔ اتنے میں ان کے مطلب کی بتی بڑھ گئی۔ اور وہ جہیں کاغذ لہراتا چھوڑا راستہ عبور کر گئے۔ خیر بادش، سردی، ہوا کے باوجود ایک صاحب نے رک کر کہا۔ یہاں تو تمام گھر ہیں۔ کوئی سرکاری دفتر ادھر نہیں ہے۔ ہم نے ایک اونچی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ تو بولے وہاں وہ البتہ سرکاری دفتر ہے لیکن معلوم نہیں کب ہے کب ہے۔ خیر جہیں اطمینان ہوا کہ وہ دفتر مطلوب نہ ہوا تو کم از کم پتہ تو ملے گا۔ وہاں کا دربان واقعی خضر راہ نکلا۔ انگریزی نہیں جانتا تھا۔ لیکن میٹرک دراز میں سے ایک انگریزی میں چھی ہوئی پرچی نکال لایا۔ ”جہاں آپ کھڑے ہیں وہاں سے فلاں سڑک پر چل دیجئے۔ دابنے اٹھ کی پہلی دو گلیاں چھوڑ کر تیسری پر بایں اٹھ مڑیے۔ وہاں سے پہلی گلی دہنی طرف پار کیجئے اور آخری بار بایں اٹھ مڑ جائیے۔ وزارت خارجہ کی عمارت بالکل سامنے ملے گی۔“

معلوم ہوا ہمیں کو نہیں — یہ مسئلہ اور لوگوں کو بھی درپیش ہوتا ہے۔ اس لئے پرچیاں چھیدا لی گئی ہیں۔ بہر حال شکریہ ادا کر کے ہم چل دیئے۔ دو گلیاں چھوڑ کر تیسری پر بایں اٹھ مڑے۔ پھر دابنے اٹھ مڑے اور پھر آخری بار بایں اٹھ مڑے تو آگے کچھ بھی نہ تھا۔ ریل کی لائن تھی۔ اور اس پار خالی کھیت تھی۔

ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے۔ ان صاحب سے ملنا بھی ضرور تھا کیونکہ بات ہمارے مفاد کی نہیں۔ ہمارے ملک کے مفاد کی تھی۔ شام بھی ہو رہی تھی پھر

ہم بس کا راستہ بھی بھول چکے تھے۔ پھر ڈرامہ لیس تھی۔ پھر ہنگ سے گاڑی پکڑنی تھی۔ پھر ڈرامہ لینی تھی۔ پھر پیدل چلنا تھا۔ پھر مسز ابزر کے ہوم کی، ۵ سیڑھیاں چڑھنی تھیں۔ منزل تیری دُور مسافر، منزل تیری دُور۔

آخر جب ہم یوس ہو چکے تھے۔ اٹھنا وہ دفتر ہمیں مل گیا۔ صاحب موصوفت اہلہ نہیں تھے۔ ہم خستگی سے بے ہوش ہونے کو تھے کہ وہ آگئے۔ بوسے امید ہے آپ کا سفر خوشگوار گزرا ہوگا اور یہاں کا راستہ آسانی سے مل گیا ہوگا؟ ہم جی کڑا کر کے چہرے پر مسکراہٹ لاتے اور کہتا بھی ہاں!

آج شام ہمیں علم کا شوق اور فرض کی محبت لیڈن لے گئی۔ وہاں سے بھی بارش میں ٹرا اور چھپ چھپ کرتے آئے اس وقت ہمارا کوٹ وارڈروب میں لٹکا پنچر رہا ہے ابھرتا بھی۔ کل صبح پھر شہر سے باہر ایک اپارٹمنٹ منٹ ہے۔ ہمارا جی ابھی سنے ہول لکھا رہا ہے۔ آپ کہیں گے ہم کیوں نہیں فون کر کے ٹیکسی طلب کرتے۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اور پتے کی پرچی ڈرائیور کے حوالے کر کے پختہ ہو جاتے اور سگریٹ سلگا لینے وہ جاتے اس کا کام۔

ہمارے اس تھوڑا لکھے کو بہت جانیے کہ اس کی وجہ اقتصاد ہی ہیں۔



ایسٹریڈیم کے رستہ میوزیم میں

ہمیں بھی آرٹ سے رغبت ہے

ایسٹروڈم میں جب ہم اپنے کاموں سے کچھ کچھ فارغ ہوئے تو ایک صاحب سے ہم نے پوچھا۔ اب ہمارا یہاں سے چل چلاؤ ہے ہم نہیں چاہتے کوئی چیز ہمارے دیکھنے سے رہ جائے۔ یہاں کی کیا کیا چیزیں مشہور ہیں؟
 بوے: ”پنیر“

ہم نے کہا: ”وہ ہم نے کھا لیا، بلکہ قدرت اللہ شہاب صاحب کے ہاں کھا کے آئے تھے۔ وہ دو تین سال کا ذخیرہ اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔“
 ”دوسری چیز یہاں کی پون چکیاں ہیں۔“
 ہم نے کہا: ”وہ بھی دیکھ لیں۔ اور؟“

سوچ کر بوے: ”یہاں کے پنیر مشہور زمانہ ہیں۔“
 ہم نے ان کے گھر کے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر اس کی چوکھٹ پر ہاتھ پھیرا۔

بوے: ”میرا مطلب دروازوں، گھر کیوں پر زنگ کرنے والاں سے

نہیں ہے۔ میٹر تم نہیں جانتے کیا ہوتا ہے؟“

اب کچھ کچھ ہماری سمجھ میں آیا۔ ہم نے کہا ”معاف کرنا۔ اب ہم سمجھے۔
ہمارے ان بھی بڑے اچھے اچھے میٹر ہیں ایک سے ایک عمدہ ساٹن بورڈ
آپ کو نظر آئے گا، بلکہ شہر کی دیواروں پر لکھنے والوں میں ایک نامی گرامی میٹر
اللہ دیا ممتاز ہمارے پڑوس میں رہتا ہے۔ شاعر بھی ہے۔ ممتاز اس کا تخلص ہے
تخلص جانتے ہو کیا ہوتا ہے؟“

فرمایا: ”میرا مطلب دیواریں چھاپنے والے یا سینما کے بورڈ بنانے والے میٹروں
سے بھی نہیں ہے۔ ریمران کا نام تم نے سنا ہے۔“

ہم نے کہا: ”ایک ہفتہ تو ہمیں یہاں آتے ہو اے۔ اس میں بھی زیادہ
ترصوفیت رہی کپ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ رام رام — کیا نام بتایا تم
نے اس کا؟“

انھوں نے روکھے پن سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

ریجن میوزیم یعنی قومی میوزیم بالکل ہمارے میوزیم ہوٹل کے ساتھ لگا ہوا
ہے۔ معلوم نہیں ہمارے ہوٹل کا نام اس کی وجہ سے رکھا گیا ہے یا یہاں میوزیم
ہمارے ہوٹل کی رعایت سے بنایا گیا ہے۔ بہر حال جس کسی سے بات ہوئی انیس
نے ہم سے یہی پوچھا۔ تم نے ریجن میوزیم دیکھا کیا؟

آخر ہم نے سوچا، دیکھ ہی ڈان چاہیے۔ ہفتہ کی صبح ہماری خالی تھی۔ جا
گئے معلوم ہوا تصویروں کا میوزیم ہے۔ کچھ مجھے ہیں اور پرانا کلاٹ کبار فریئر

بھی ہے۔ سو صدیوں صدی کا۔ سترھویں صدی کا۔ ہم تو یہ کرتے ہیں کہ کوئی چیز پرانی ہوئی۔ مثلاً چارپائی ٹوٹنے لگی یا کرسی کا ہتھا اکھڑ گیا تو اسے پھینک دیا یا آگ بجلائی۔ مغربی ملکوں میں ایسا نہیں کرتے۔ پرانی چیزوں کو سنت سنت کر رکھتے ہیں چنانچہ کئی کمرے پرانے فرنیچر سے بھرے ہوتے دیکھے۔ ہمارے گھر میں بھی پندرہ پندرہ بیس بیس سال کے کھٹولے۔ میز۔ ٹرنک۔ بدھنے۔ مرتبان۔ کیلنڈر۔ چمچے۔ سرے دانیاں۔ تو شک وغیرہ بھرے پڑے ہیں۔ ہمیں ان کی قدر و قیمت کا خیال نہ آیا۔ اگر ہمارے آنے تلک۔ ہمارے گھر والوں نے پھینک نہ دیئے ہوں تو ہم بھی میوزیم بنائیں گے۔ یہ چیزیں تو پھر حال کی ہیں۔ بعض میوزیموں میں تو ہم نے چھپ چھپ تیس تیس صدی پرانی اور بے کار چیزیں بھی دیکھیں۔

ہم نے کہا۔ ”یہ کچھ نہیں۔ کچھ اور دکھاؤ“

تب ایک گائیڈ نے ہمیں ویلفٹ کی پرانی ٹائوں کا ذخیرہ دکھایا۔ اس وقت تو ہم نے تعریف کی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ویسی ہیں جیسی شوکت صدیقی نے اپنے چھانک کے ستونوں پر لگا رکھی ہیں، کوئی کمال کی بات نہیں :

اس کے بعد تصویروں کے کڑوں کا نمبر آیا ہم نے سنا تھا کہ ریمبران نامی مصور نے ٹائٹ داچ نام کی جو تصویر بنائی تھی اس کی وجہ سے یہ میوزیم دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ریمبران کی بہت سی اور تصویریں بھی اس میوزیم میں بتائی گئیں ایک اور شخص کی بھی جس کا نام فان گوگ یا ایسا ہی کچھ تھا جس شخص کا نام ایسا عجیب غریب ہو وہ بھلا کیا تصویریں بناتے گا۔

خیر ہم نے میوزیم کا ٹکٹ خریدا تھا۔ اب تصویریں دیکھنی آئیں۔ ہم نے



کراچی آرٹ کونسل میں تصویروں کی کئی نمائشیں دی گئی ہیں اور خود بھی ایک زمانے میں آرٹ سے شغف رہا ہے جب ہم اسکول میں پڑھتے تھے ماسٹر محمد دین جہری ڈرائنگ کی کلاس دیا کرتے تھے اور ہم سے صیب کیلئے 'گلاس' مرتبان، طوطے اور مود وغیرہ بنوایا کرتے تھے۔ ہمارا ہاتھ ہمارے ہم سبقوں میں سب سے زیادہ رواں تھا۔ خود ماسٹر محمد دین بڑے باکمال آرٹسٹ تھے لیکن ہمارے بے قدرتی زمانہ — ہمیں تو کوئی کیا جانے گا، آج کوئی ان کا نام بھی نہیں جانتا۔ سوائے ان کے شاگردوں کے — وہ بھی شاید اس لیے کہ مارتے بہت تھے۔



اس میوزیم میں کمرے ہی کمرے ہیں۔ سب تصویروں سے بھرے ہوئے بعض تصویروں کے چوکھٹے بے حد خوبصورت ہیں۔ جی چاہتا تھا کہ چوکھٹا نکال لیں اور اس میں اپنی تصویر لگائیں۔ ایک تصویر میں ایک شخص تلوار لگائے کھڑا تھا۔ پیچھے چاند بھی نکلا ہوا تھا۔ ہم نے کہا۔ یہ ٹائٹ وارج ہے؟ بڑی خوبصورت تصویر ہے؟

معاذ اللہ بتایا۔ نہیں! یہ ٹائٹ وارج نہیں ہے۔ وہ تو ریمبران کا شاہکار ہے۔ گیلریوں میں چلتے جاؤ۔ آگے ملے گا۔

آگے ایک کمرے میں ایک کلاک کی تصویر تھی۔ ہمیں خیال آیا شاید وارج سے

مطلب کھڑی ہو۔ ہم نے اس کمرے کے محاذ سے کہا: ”یہ تو نہیں ریمران کی
نائنٹ واپچ؟“

علوم ہوا۔ ”یہ بھی نہیں ہے، آگے ہے۔“
خیر تصویریں دیکھتے نام پڑھتے، تحسین اور آفرین کے طور پر سر ہلاتے ہم ایک
بڑے ال کمرے میں پہنچے۔ بہت سے لوگ ایک تصویر کے گرد کھڑے تھے۔ کسی
نے ہمیں اشارے سے بتایا: ”یہ ہے ریمران کی نائنٹ واپچ۔“

بہت بڑی تصویر ہے۔ پوری دیوار ڈھانپ رکھی ہے۔ دوسروں کی طرح ہم
نے بھی اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، جینک لگا کر دیکھا۔ جینک اتار کر دیکھا۔
اس کمرے میں اس تصویر کو دیکھنے کے لئے صفوں بھی لگائے گئے ہیں۔ ہم نے بھی
ان پر ٹھیک لی۔ اس میں سامنے ایک بادشاہ ہے۔ ہمارے خیال میں تو بادشاہ ہی
ہوگا۔ ساتھ ایک ٹوپی والا جنرل سمجھ لیجئے، ایک شخص بندوق لئے بھی کھڑا ہے۔
تصویر کے دھننے اتھ ایک ڈھول والا ہے۔ پیچھے کی جگہ بھرنے کے لئے کچھ اور
آدمی بھی دکھائے گئے ہیں۔ کسی کا منہ کسی طرف کو ہے۔ کسی کا کسی طرف کو.....
ذرا ٹھہریے۔ کتاب میں دیکھیں۔ ہم نے میوزیم کی گائیڈ بھی تو خریدی ہے۔ دیکھئے
صفحہ ۱۵۔ اور ۱۶۔ ”ریمران۔ ریمران۔“ (۱۶۰۶-۱۶۹۹) اپنے زمانے کا
بہت بڑا آرٹسٹ تھا (بے شک اپنے زمانے کا ہوگا۔ ہم نے سوچا) لیڈن کا رہنے
والا تھا۔ پھرامیٹرڈم چلا آیا اور جب تک مرنے لگا۔ وہیں رہا۔ اس کی بنائی ہوئی
تصویروں میں یہودی دامن۔ پطرس ولی کا انکار (.....) اسے یہ کیا فضول۔
تفصیلات ہیں ”نائنٹ واپچ کا ذکر“ ناچا ہے (.....) یہ رہا دیکھنے والا لکھتا ہے کہ ریمران

کو غائب (یعنی یقین نہیں ہے اور گائیڈ لکھنے بیٹھ گئے ہیں) اس وقت یہ تصویر بنانے کو کہا گیا تھا جب فرانس کی جیوہ ملکہ میراڈی میڈسٹی ۱۶۳۹ء میں ایسٹرم آئیں۔ یہ تصویر کپتان فرانسز جینگ ٹوک اور لفٹیننٹ ولیم فلن رڈی برگ کی کمپنی کی ہے۔ لیجئے جن کو ہم نے بادشاہ اور جرنیل سمجھا تھا وہ فقط کپتان اور لفٹیننٹ وغیرہ تھے۔ آنا بڑا آرٹسٹ۔ کسی کرنیل جرنیل کی تصویر بنائی ہوتی تو ایک بات تھی چلتے یہ بھی تحقیق ہو گیا کہ تصویر حسب فرمائش بنائی گئی ہے، اپنی مرضی یا شوق سے نہیں ایسا کام تو پھر ٹالا جاتا ہے۔ کتاب بند کر کے ہم نے تصویر پر پھر غور و فکر شروع کیا۔ دیکھا کہ اس میں گزرائی پیدا ہو رہی ہے۔ لوگ زندہ اور جاگتے معلوم ہو رہے ہیں۔ پیچھے تاریک مہراب نے سارے منظر کو ابھار دیا ہے۔ کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا۔ گویا بڑی تصویر نہیں۔ کم از کم ہماری رلنے تو یہی ہے۔

نائٹ داج دیکھ لی نیشنل میوزیم میں کچھ اور شے بھی تھیں۔ ایک پرنٹ روم۔ ایک ڈول ڈاؤس! اب یہ دیکھنے باقی تھے۔ ایک جگہ کچھ چینی جاپانی کتابیں اور خاکے سے پڑے تھے۔ ہم نے محافظوں سے کہا۔ تصویریں تو ہم نے ساری دیکھ لیں۔ یہ پرنٹ روم کہاں ہے؟ کس طرف کو ہے؟ کدھر ہے؟

بولتا: جناب! یہی تو پرنٹ روم ہے؟

آگے پھر ایسی دارات ہوئی۔ ہم نے ڈول ڈاؤس کا پتہ پوچھا۔ محافظ بولا۔

”حضور، آپ اس وقت ڈول ڈاؤس میں کھڑے ہیں“

ہم نے کہا: ”باہر جانے کا راستہ کون سا ہے؟“

اس نے ایک طرف کو اشارہ کیا۔ ویسے EXIT لکھا بھی تھا۔

ہم نے صدر دروازے پر اپنا کوٹ لیا۔ چوکیار کوٹپ دی اور باہر نکل آئے
 باہر خوشگوار موسم تھا۔

سائنسز رلیئنڈ

۶ نومبر تا ۱۱ نومبر ۱۹۶۷

RECEPTÖ



ہوٹل سان سان سان

انسان بھی کیسا پچھیر دے۔ صبح ہم ایسٹرڈم میں تھے، اس وقت جنیوا میں ہیں بلکہ دوپہر سے پہلے ہی ان اترے تھے۔ اتوار کا روزہ ہمیں یہ توخیر توقع نہ تھی کہ کوئی مار ٹھہرتے جھنڈیاں اور ڈھول تماشے لے کر ہمارا استقبال کرے گا۔ ان کرنتوں کو ہماری قدر کیا معلوم۔ تاہم اب تک یہ ہوتا تھا کہ عموماً ہوٹل کی خبر ہوتی تھی۔ یہ معلوم رہتا تھا کہ کل کہاں کس سے جا کے ملا ہے بعض اوقات یورپ والے پردیسوں کو طرح طرح سے پریشان کرتے ہیں۔ یعنی ہم فرنیچرٹ میں آکے اترے ہیں اور دارالحکومت ان لوگوں نے بون بنا رکھا ہے سوئٹزرلینڈ میں جنیوا اچھی جگہ ہے۔ ہمارے جہاز کو ہمیں اترنا ہے لیکن سوئٹزرلینڈ کی حکومت جہاں تک ہمارا خیال ہے برن میں ہے۔ سوایجوکیشن کے انٹرنیشنل بورڈ کا نام تو ہمیں معلوم تھا اور یہ کہ ہمیں وہاں جانا ہے لیکن یہ پوچھنا ہم بھول گئے تھے کہ کہاں ہے۔ کس نگر میں ہے۔ خیر ہم نے سوچا اس وقت تو کہیں ٹھکانہ ڈھونڈ لیں صبح معلوم کریں گے۔ برن جانا پڑا تو رہ جائیں گے۔

پس ہوس ایتر کے کونٹر پر بیٹھی کوئی نار سے ہم نے کہا کہ قربانت ٹوم۔ ہمیں کوئی ہوٹل تبادو۔ مفت کا ہو تو کیا کہنے ورنہ ہم کرایہ بھی تھوڑا بہت دینے کو تیار ہیں۔ ہو فٹ کاس غسل خانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہوٹل بھی اس پاس چاہیے۔ جہاں ممکن ہو تو ہم اپنا سوٹ کیس خود اٹھا کر لے جاسکیں۔ اس کے علاوہ اس بی بی نے کہا: ”آج تو اتوار ہے۔ آج تو ٹورسٹ دفتر تک بند ہیں جو اس قسم کے اشتہام کیا کرتے ہیں۔ میں کیا کر سکتی ہوں“

ہم نے کہا: ”کچھ نہیں ہو سکتا؟“
 بولیں: ”کچھ نہیں“

ہم نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور کہا: ”تو آج کی شب اسی پنج پر نہ استراحت کر لیں۔“

گھبرا کر کہنے لگیں: ”نہیں نہیں، ٹھہریے۔ میں کوشش کرتی ہوں۔“
 اب اس نے ایک فرسٹ دلکھی، ایک دو جگہ فون کیا اور پھر کہا: ”ہوٹل ماں ساں میں چلے جاتیے۔ نیکوٹ پر ہے۔“
 ہم نے کہا: ”یہ کیا نام ہوا۔ جہیں لکھ کر دو۔“

وہ ساں ساں نہیں تھا۔ ہمارے ہی کون ساں ساں کر رہے تھے۔

ساں یردے تھا ST. GERVAIS انگریزی تاجدے سے سینٹ جرویس ہونا چاہیے۔ جرویس صاحب کوئی سادھو سنت ہوں گے مسیحی مذہب کے۔ ایک خستہ پراس بی بی نے نشان بھی کر دیا کہ اس سامنے کے چوک کو پار کر کے گرجا ملے گا۔ اور اس گرجا کے بس پیچھے ہے۔

ہم خوش خوش سوٹ کیس اٹھاتے باہر نکلے تو اس چوک کے چاروں طرف
 گرجا نظر آئے۔ چاروں طرف تو خیر نہیں تین طرف۔ کیونکہ چوتھی طرف سے تو ہم
 خود آرہے تھے۔ جو ایرٹرمنیل بھی تھا اور جینیوا کا بڑا ریلوے اسٹیشن بھی بیٹھ کر
 نقشے کا مطالعہ شروع کیا۔ کچھ اس کا اثنا سیدھا سمجھ میں نہ آیا۔ خاصی غفلت سلیم خرچ
 کی تو سمجھ میں آیا کہ دہنی طرف کو جانا ہے۔ تھوڑی دیر غور کرنے پر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ
 ہمارا وایاں ہاتھ کون سا ہے۔ چنانچہ ادھر کو رواں ہوئے۔ گرجا کے چاروں طرف
 گھوم گئے۔ کبھی کبھہ مرے پیچھے تھا، کلیسا مرے آگے۔ کبھی کلیسا مرے پیچھے تھا اور
 — خیر۔ آخر تھک گئے۔ اس نام کا ہوٹل نہ ملا۔ ہاں اور ناموں کے ہوٹل ضرور
 نظر آئے۔ آخر ہم نے سامان باہر رکھا اور ایک ریسٹوران میں گھس گئے اور بیرے
 سے کہا: ”ہوٹل سالیرو سے کدھر ہے موسیو“

ہم تو خیر فریخ میں اتنی دستگاہ رکھتے تھے کہ اس شخص کو بشر کی بجائے موسیو
 کہہ کر خطاب کیا لیکن وہ شخص انگریزی سے بالکل ہی کو رانگلا۔ کاندھا جھٹک کر رہ
 گیا۔ ایک اور شخص جو بیٹھا چائے پی رہا تھا البتہ ازراہ ہمدردی تین چار منٹ تک
 بڑی وضاحت سے ہمیں یہ بتایا۔ لیکن وضاحت چونکہ بزبان فرانسیسی تھی اس لئے
 ہم فرسی کہہ کر باہر نکل آئے کہ کسی اور سے پوچھیں گے، یا کسی اور ہوٹل میں چلے
 جائیں گے۔

اور ہم نے یہی کیا۔ ایک ہوٹل میں گھس گئے اور کہا۔ ”مرہ چائیے ینگل وہی
 کراتے کا۔“

مینجر نے کہا: ”واجبی کراتے ہی کا ہے۔ ۵۲ فرانک روزانہ۔ ۱۵ فیصد مردس۔“

اس کے علاوہ ناشتے کے پیسے اسی کرائے میں شامل ہیں الگ نہیں ہوں گے۔
 اس آخری پیشکش کا تو ہم نے موزوں الفاظ میں شکریہ ادا کیا لیکن ہمیں
 جو روزیہ ملتا ہے اس کے حساب سے ہمیں ۱۵ فرانک کا کمرو چاہیے تھا۔ حد
 سے حد سب کچھ ٹاکر ۲۰ فرانک کا۔

آخر ہم نے کہا: ہوٹل ساں میروے کہاں ہے؟ ہماری وہاں ریزرویشن ہو
 چکی ہے۔ ورنہ ہم ضرور آپ کے ہاں ٹھہرتے۔ آئندہ سہی۔
 مینجر اور میرا دونوں بااخلاق آدمی تھے۔ ورنہ بعض ملکوں میں تو ایسے مسافر
 کو دھکے دے کر باہر نکال دیتے ہیں۔ میرے نے کہا وہ سامنے لگی ہے اس میں
 بائیں ہاتھ کو تیسرا مکان ہوٹل ساں میروے ہے؛ گڈ بائی سر!
 ہم نے کہا: گڈ بائی! اور پھر سوٹ کیس اٹھا لیا۔

اب یہ ہوٹل کیسا ہے۔ ہم ہوٹلوں کے متعلق لکھتے لکھتے تنگ آ گئے ہیں۔
 ہمیشہ یہی لگا کہ ہوٹلوں میں میسٹر جیوں کے نیچے ڈیوڑھی کے اوپر کسی کوٹنے
 کھدے میں جہاں کوئی گھیارا سا ہوتا ہے اس میں لوگ ایک جھرو بنا کر اُسے
 ہمارے لئے ریزرو کر دیتے ہیں۔ بہر حال ہم اس ہوٹل میں خوش ہیں اور آئندہ
 بھی ہر ہوٹل میں خوش رہیں گے کیونکہ ایسٹرڈم میں مسز ابرز کے ہوٹل میں چھ
 راتیں گزار چکے ہیں۔ اب ہمیں کہیں تکلیف نہیں ہو سکتی۔

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
 نظم حسرت میں وہ مزانہ رہا

ہوٹل والے نے ہمارا سامان تو رکھ لیا لیکن ابھی گیارہ بجے تھے۔ فرمایا بارہ بجے سے دن شروع ہوتا ہے۔ اس وقت آئے گا۔ فی الحال باہر کی ٹنڈی ہوا کھائے گا۔ ہم نے کہا ہمارا ارادہ بھی فی الحال سیر کا ہے۔ ہمارا کیا ہے۔ ہمارے سامان کو سرچھپانے کی جگہ چاہیے۔“

ہم نے ابھی ابھی پانچ پونڈ کا نوٹ بھنایا تھا۔ ڈسٹر کر ایک پونڈ کا کھانا کھایا اس کے بعد مونچھوں — یا مونچھوں کی جگہ پر تاؤ دیتے ہوئے نقشہ دیکھ کر جھیل کی راہ ل۔

جب ہم آئے ہیں تو موسم ٹھیک تھا۔ لیکن رستوران سے نکلے تو بارش شروع ہو گئی تھی۔ اور سردی بھی۔ جھیل کے ساتھ ساتھ ہم تھوڑی دُور تک تو کچھ بھگتتے اور کچھ بچتے گئے لیکن کنپٹیاں اور کان سہی ہو گئے۔ موسم ہمارے سامنے کیا چڑ ہے۔ موسم کی ہم تھوڑا کئے پروا نہیں کرتے جہاں ہمارے دشمنوں کا بال بیکا ہوا۔ ہم نے ڈاکٹر محمد سرور کو فون کیا لیکن یاد آیا کہ یہ تو کراچی نہیں۔ جینو ابے میاں۔ ڈاکٹر آیا بھی تو فیس ملے گا اور فیس تم نے منہ مانگی نہ دی تو تمہارا یہ سوٹ کیس اٹھا کر لے جائے گا۔ ٹاپتے رہ جاؤ گے۔ پس چلو واپس ہوٹل۔ بارہ بھی بج رہے تھے اس وقت تو ہم آگئے اور ٹھہر ٹھہر کر تے سو گئے۔ شام کو پھر نکلے۔ جینو کے ارد گرد پہاڑ والی برف پوش چوٹیاں ہم نے جہاز ہی سے دیکھ لی تھیں اور جھیل بھی اصل میں ہمارے اب بیاں اترنے کی حاجت نہ رہی تھی کیونکہ لوگ یہی چیزیں دیکھنے بیل آتے ہیں۔

بازار میں شیشوں کے پیچھے گھروں کے ڈھیر کے ڈھیر نظر آتے ہر شکل صورت

کی گھڑیاں۔ ہر قیمت کی گھڑیاں۔ سو گھڑیوں کے تاجروں کو تو یہاں ضرور آنا چاہیے
 لیکن باقی لوگ کیوں آتے ہیں یہ ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ ایسٹریڈم میں موسیونان میٹر
 نے کہا۔ میں تو ہمیشہ بھری سردیوں میں سوئٹز لینڈ جاتا ہوں اور اپنی چھٹی وانا
 گزارتا ہوں۔ ہم نے کہا سردیوں میں تو وانا سردی ہوتی ہوگی بلکہ برف بھی۔ بوسے
 برف ہی کی خاطر تو جاتا ہوں۔ عجیب لوگ ہیں برف دیکھنے اتنی دور آتے ہیں۔ کیا
 ان لوگوں کے گھروں میں ریفریجریٹر نہیں ہیں۔ ہم نے یہاں کی برف دیکھ لی ہے۔ اب
 سوئٹز لینڈ کی یاد آنا کرے گی تو اپنے فریج کا اوپر کا خانہ کھول کر دیکھ لیا کریں گے۔
 اب رہا برف پر پھسلنے کا شوق۔ سو ہر شوق کی ایک عمر ہوتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب
 ہم بھی جس چیز کو جس صدمت کو دیکھتے تھے اس پر پھسل پڑتے تھے۔ اب وہ بات نہیں
 آج ہی شام جینیوا کی جمیل کو بھی چل پھر کر بنظر فائز ہم نے دیکھ لیا اس میں ہمیں پانی
 تو نظر آیا اور کوئی خاص بات دلکاش نہ دی۔ سوئٹز لینڈ اور اس کے پہاڑ اور اس
 کی جمیلیں اور ان کی خوبصورتی۔ تاریک کرام۔ یقین کیجئے۔ سب پراسپیکٹ ہے پراسپیکٹ۔

کھونا اکاؤنٹ سوئزر لینڈ میں

اے لوگو! اے وہ تمام لوگو جن سے ہم صمیم قلب سے وعدے کر کے چلے
تھے کہ تمہارے لئے کیمرو لائیں گے، تمہارے لئے گھڑی لائیں گے۔ تمہارے لئے
ٹیپ ریکارڈ لائیں گے۔ سب کچھ بھول جاؤ اور ولایت کے پتے پر ہمیں خط لکھ دو
کہ تم نے جہیں معاف کر دیا۔ بخش دیا۔ ہم تم کو مرنے نہیں دکھا سکتے۔

صحیح یہ ہے کہ ہم نے تو اپنی طرف سے جزیسی کی بہت کوشش کی لیکن قدرت
ہی کو ہماری نجاست منظور ہے۔ کل کی لیجئے۔ ہم نے کمرے میں بند ہو کر بیٹ
کھا لئے اور پانی پی لیا۔ اور اوپر سے نمک سلیمانی چھانک لیا۔ کیونکہ ویسے یہ خوراک
نقصان کرتی ہے۔ اندر جا کر پھول جاتی ہے۔ شام کو البتہ پیٹ نے کہ بڑا بدکار
ہے کھانا مانگا۔ کھانے کے معاملے میں ہم نے مدت سے ترک حیوانات کر رکھا
ہے۔ بیف یعنی بڑا گوشت ہم سے کھایا نہیں جاتا۔ برلن میں ایک روز بیف
ایٹیک سے لیا تھا۔ کھانے اور پچانے کی منزل ہی نہیں آئی۔ ہماری چھری سے کٹا
تک نہیں۔ ہمارا خیال ہے اصل بیف نہیں تھا۔ نائیلون وغیرہ کا بنا ہوا تھا۔ خیر

ہم نے چوم کر چھوڑ دیا۔ اور ادھر ادھر سے آلو کھائے۔ لندن میں ہم لمب یعنی
بیرڈ کے بچے کا گوشت رغبت سے کھاتے تھے۔ حلال حرام کی بحث اخبار میں
چھڑی تو اس سے بھی گنتے۔ معری کے متعلق ہم نے اور علامہ اقبال نے سنا تھا۔ کہ
گوشت نہ کھاتا تھا۔ پھل پھول پرگزراؤقات کرتا تھا۔ ایک روز کسی نے اسے بھونا
ہوا تیترا بھیجا تو بجائے اس کے کہ چپکے سے کھائیتا، فلسفہ چھانٹنا شروع کر دیا کہ
جرم ضعیفی کی مزا مرگ مغالعات ہے۔ ہمارے معری بننے کی راہ میں کئی چیزیں
حائل رہیں۔ پھل پھول بھی یہاں کچھ سستے نہیں ہیں اور کوئی شخص نعمت سے
جہیں بھونا ہوا تیترا بھیجے تو ہم سے انکار نہیں ہو سکتا۔ انکار کیا معنی نہیں ہم
کوئی چیز کھاتے ہیں تو وہ تیترا کا ہم نسل مرغ ہی ہے۔ جتنا ہوا مرغ بلکہ بھنے
ہوئے مرغ کی ایک ٹانگ۔ سو کبھی یہ پانچ روپے کی آتی ہے کبھی سات روپے
کی۔ بون میں ہرٹی کے ڈپارٹمنٹل سٹور سے تو ایک بار ڈھائی مارک کی بھی مل گئی
تھی، لیکن پھر اس کا مرغ بالا ہی ہوتا گیا۔ جیوا اگر پہلے روز ہم نے ساڑھے
پانچ فرانک یعنی ساڑھے پانچ روپے کی لی۔ دوسرے روز ایک جگہ ساڑھے
چھو کی ملی۔

لیکن ذکر ہم کل کا کر رہے تھے کہ شام کو پیٹ نے ہمیں مجبور کیا کہ کھول
بٹا۔ کھلا ہیں کھانا۔ ہم نے پچکارا کہ میاں ٹھہر۔ کوئی ہوٹل دیکھتے ہیں جس میں عام
قسم کے آدمی بیٹھے ہوں۔ کیا کھائے گا سینڈوچ کھلائیں؟ پنیئر کے سینڈوچ بٹے
اچھے ہوتے ہیں۔ لیکن پیٹ کی وہی رٹ۔ مرغ کی ایک ٹانگ۔

آخر ہم جی کڑا کر کے ایک ریسٹوران میں گھس گئے اور کھا کھانا کھائیں گے ہم

بیراہیت مرقوب اور تاکہ عدے کا تھا۔ ایک کمرے میں ہمیں بے گیا۔ اور بولنا کیا چلی گئے
 ہم نے کہا ”کچھ نہیں۔ ہم مسلمان ہیں۔“
 ”سوپ، کیا لاؤں؟“

ہم نے کہا ”سوپ وہ نہیں چاہیے۔ ہمارے ان اس کا رواج نہیں۔“
 ”کوئی آشتیا افزا چیز حاضر کروں۔“

ہم نے پھر کہا ”کچھ نہیں، ہمارا پیٹ ہی بھوک سے دم تھکا جا رہا ہے اور ان
 شکر میں منہ ہے۔ لہذا بعد میں میٹھا لٹنے کی بھی کوشش نہ کرنا۔ ان کا پی پیس گئے۔“
 ”تو پھر کھائیں گے کیا آپ؟“
 ”مرغ کی ایک ٹانگ۔“

برے نے بس ایک چھری کا ٹاشا ہماری میز پر رتبے دیا باقی سارے اٹھائے۔
 تھوڑی دیر بعد آیا۔ ایک چمکھا قسم کی چیز لایا جس کے اندر موم جی جلی رہی
 تھی۔ زیادہ تکلف کے ہوٹل میں کھانا گرم رکھنے کے لئے اسی قسم کے چرخیلے ہوتے
 ہیں۔ اب ہمارا ماتھا ٹھنکا۔

وہ تو اندر گیا۔ ہم نے بڑا نکال کر رقم گنی۔ خاصے روپے تھے! اطمینان ہو گیا۔
 پیٹے وہ پانی کا پیالہ لایا جس میں لمبوں کی تاش پڑی تھی۔
 ہم نے اسے ایک طرف کھسکا دیا۔

پھر وہ سلاوا کا پیالہ لایا۔ ہم نے اسے سونگھا۔ شاید زیرتون کا شیل یا ایسی ہی
 کوئی چیز سلا دیں تھی۔ ہم نے اسے بھی پرے کھسکا دیا۔

آخر میں وہ جرم ضیفی کی مزا یعنی مرغ کا پارچہ لایا۔ پیٹ کو چھلے پر رکھا

اس پارچے میں سے آدھا نہایت ادب سے کاٹا اور ہماری پلیٹ میں رکھا۔
 ہم نے کہا 'مرسی' یعنی شکریہ۔ اب جاؤ۔ ہم خود ہی کھائیں گے۔
 کھانا کھایا۔ اور کافی پی۔ بل آیا ساڑھے بارہ فرانک کا۔ اس پر ۱۵ فیصد ٹرس
 چارج بھرا چودہ سے کچھ زیادہ۔ اب کیا چون فرانک ٹپ بھی نہ دیتے۔
 ہم نے بڑی بے اعتنائی سے ہندہ فرانک اس کے حوالے کئے۔ کوٹ بٹھالا
 اور باہر —

لندن میں پھرا چکا تھا۔ مسز وائٹس کے بھتیجا رنلڈ نے میں رہ کر ہم نے کچھ پونڈ بچائے
 تھے جو جرمنی میں خرچ ہوئے۔ جینیوا میں ایک صاحب وطن عزیز کے مل گئے۔ ہماری
 ہی طرح کام کے بدلنے دھپل میں یورپ کی سیر کر رہے تھے۔ کفایت شعاری کی
 خوبیوں پر بات چھر گئی۔ ہم نے بھی اسراٹ کرنے والوں کی جی کھول کر رُائی کی اڈ
 کہا۔ دیکھئے لندن میں ہم نے اپنے وظیفے میں سے بچا کر یہ سوٹ خریدا ہے کیا ہے؟
 وہ کچھ متاثر نہ ہوئے۔

اب ہم نے کہا 'یہ ادور کوٹ بھی ہم نے اپنی بچت میں سے یا ہے۔ دس
 پونڈ کا آیا تھا۔'

ان پر پھر بھی کچھ خاص اثر نہ ہوا۔ ہم نے ٹائیلوں کی دو قیضیں، جرابوں کے
 جوڑے اور متحدہ ڈائیاں خریدی تھیں۔ وہ بھی دکھائیں کیونکہ ہم اس وقت داد
 طلبی کے موڑ میں تھے۔

اس کا کما حقہ رد عمل نہ ہوا تو ہم نے سوٹ کیس کھول کر چھپتی مٹی کی نیلی پلیٹ

”کالی اور کٹا۔ ڈلفٹ کی ہے، اور یہ دیکھو اس پر پون چکی بھی بنی ہوئی ہے۔“

”بڑی مشکل سے بولے“ ہاں ٹھیک ہے۔“

اب ہم نے انھیں پون چکی کا ایک اور نمونہ دکھایا۔ یہ بھی ہم نے یڈن سے بٹے جاؤ سے خریدا تھا۔ آرٹ کا البم۔ پرانی تصویروں کے کچھ پرنٹ۔ پچھلی صدی کے کچھ سنگزین اور شاعری کی کچھ کتابیں بھی دکھائیں۔ یہ سب ہم نے انگلستان اور فرانس اور جرمنی سے فراہم کی تھیں۔

بولے ”کیمرو کونسا لیا ہے؟“

ہم نے کہا: ”ہمیں کیمرے وغیرہ پسند نہیں، مصوری اور تصویر کشی وغیرہ جاتے شوق نہیں ہیں۔ ماہرین کے لئے ہم نے شاعری سیکھ لی ہے۔ اسی سے کام نکل آتا ہے۔“

”یٹ ریکارڈ؟ ٹیلی ویژن؟ ٹرانزسٹر؟“

ہم نے انھیں بتایا کہ گانے بجانے کے آلات بھی ہمارے دائرے سے خارج ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں ہم نے ایک سیکنڈ ہینڈ مرنی ریڈیو لیا تھا۔ بڑی خوش اسلوبی سے کام دے رہا ہے۔

اس پر وہ اپنے کمرے میں لے گئے۔ بولے ”ٹیلی ویژن سیٹ تو میں نے ہیک کر دیا ہے۔ یہ یٹ ریکارڈ ہے۔“

”اور یہ کیا ہے؟“ ہم نے کہا

بولے ”یہ ایکٹرک ٹرانزسٹر ہے!“

ہم نے کہا ”ایکٹرک ٹرانزسٹر کی بات نہیں۔ اس کے پاس جو ہے؟“





بولے: ”پریشر لگ رہا ہے۔ کبھی دیکھا نہیں تم نے؟“

ہم نے کہا: ”ان چیزوں کی بجائے تم فریج لے لیتے تو اچھا تھا۔ گرمیوں میں کام آتا ہے۔ پانی ٹھنڈا رہتا ہے۔“

بولے: ”اں یا ہے وہ کمپنی نے سیدھا سمجھوا دیا ہے۔“

اور کیا کیا ہے؟ اب ہمارا مورال کچھ گرنے لگا تھا۔

بولے: ”بس اور کچھ نہیں یا۔“ ان فیٹ کار کے پیسے لندن میں جمع کرادیئے

ہیں۔ اٹلی سے جہاز میں بار ہوگی۔“

ہم نے کہا: ”تم نے پوتن چل کے فونے نہیں خریدے کیس؟“ ہالینڈ کی

خاص چیز ہے۔“

بولے: ”فلیس کا کارخانہ بھی تو ہالینڈ ہی میں ہے۔ نیچے جو ڈبر رکھا ہے اس

میں فلیس کا ٹرنزسٹر ہے۔“

تب ہم نے پوچھا: ”کھاتے کیا تھے آپ؟“

بولے: ”ڈبل روٹی کھاتا تھا۔ ایک ڈبل روٹی، ایک ڈبر پنیر کا، مجھے کیسی

جان کے لئے دو تین دن کو کافی تھا۔“

”رہتے تو ہوٹل میں ہو گئے؟“

بولے: ”یہ کمرہ الگ لینے کی عیاشی نہیں کرتا تھا۔ لندن کے مضامین میں ایک

کمرہ ہے کہ ہم تین آدمی رہتے تھے۔ اپنی اپنی چار پائی کے پیسے دیتے تھے۔ اب

یہاں ایسٹرڈم میں سنکھل کمرہ لینا پڑا ہے۔ کمرہ تو تمہارے ساتھ آجاؤں۔ آدھا،

آدھا دونوں دے دیں گے۔“

ہم نے غور کر کے کہا: تمہیں تکلیف ہوگی کیونکہ ہم رات کو خراٹے لیٹے ہیں۔ ورنہ انکار نہیں تھا۔“

اب ہم نے عزم بالجزم کیا کہ گزشتہ راصلوات۔ اب ہم بھی کفایت کریں گے۔ جینیوا آنے پر ہمیں جو گزارہ ملا اس میں سے ہم نے سو فرانک پہلے ہی ان سوئزر لینڈ کے ایک مشہور بینک میں جمع کرا دیئے۔ اور طے کیا کہ ان کو ہم اب نہیں دکھائیں گے۔

سوئزر لینڈ کے بینک دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ہزاروں لاکھوں روپے کے کاروبار کرتے ہیں۔ رازداری ان کا اصول ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے حکمران اور سیاستدان اور ملک التجاران بنکوں میں پیسے جمع کرا دیتے ہیں کہ کل کھان تخت کا تختہ ہوا تو سوئزر لینڈ میں جا رہے ہیں گے یا اس جمع جتھا کے بل پر کہیں اور بیٹھ کے عیش کریں گے۔ اور بقیہ عمر یاد خدا میں گزاریں گے۔

ہم نے بھی یہ پیسے جمع کرتے وقت خراچی سے کہہ دیا کہ میاں اس رقم کا کسی کو قانون کا نپتر نہ چلے۔ ہمارے ملک کا قانون بہت سخت ہے کوئی شخص باہر روپیہ نہیں رکھ سکتا۔

اس نے کہا: اطمینان رکھئے۔ ہم کسی کو نہیں بتاتے۔ آپ کے ملک کے اور بھی بہت سے رؤسا اور سیاست دانوں اور سابق وزیروں کے اکاؤنٹ ہمارے ہاں ہیں۔ بھٹے تو سووے کر کے اپنا کمیشن سیدھا یہاں جمع کرا دیتے ہیں۔ ہم نے کہا۔ تم لوگوں کا اصول رازداری ہے اس لئے سب کے نام تو نہیں

پوچھتے۔ چند ایک کے بتا دو۔ ہم اپنے کالم میں تو شاید لکھ دیں۔ ویسے کسی کو نہیں بتایا ہی گئے۔

لیکن وہ شخص تیار نہ ہوا۔ اصل میں ہم بڑی ہوشیاری اور ترکیب سے اس کا امتحان کر رہے تھے۔ کسی کا نام وہ ہمیں بتا دیتا تو اس کا امکان تھا کہ ہمارا بھی کسی کو بتا دیتا۔

ادریوں سوئٹزر لینڈ کے سب سے بڑے اور با اعتماد بینک میں ہمارا اکاؤنٹ کھل گیا۔ ہم نے خفیہ اکاؤنٹ نمبر بھی لے لیا اور حساب کرنا شروع کیا کہ کتنی شرح سود ہے۔ دس سال میں ہماری رقم دو گنی ہو جائے گی۔ یعنی دو سو فرانک اور پچاس سال میں تو یہ کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی۔ ہم نے حساب پھیلایا تھا؛ لیکن ہم سے نہ ہوا۔ آٹھابڑا حساب تو کمپوٹر ہی کر سکتا ہے۔

افسوس کہ یہ پھول دو دن ہمارے جانفزا دکھا کر مرجھا گئے۔ آج صبح ہم نے یہ پیسے نکوالئے۔ بس کچھ ایسی ہی بات تھیں۔ ہوٹل کا بل دینا پڑ گیا۔ اس کے علاوہ حتیٰ الوسع اپنے ملک کے قانون کی خلاف ورزی کرنا بھی ہمیں پسند نہیں۔

ہم جنیوا سے چل دیے

اگر ہم جنیوا سے برن نہ آتے، جیسا کہ پروگرام نہیں تھا، ہمارے پاس ہوائی جہاز کا ٹکٹ جنیوا تا زیورخ موجود ہے تو سوئٹزرلینڈ کے متعلق ہماری رائے اسی قسم کی رہتی جیسی متحدہ مائٹھیٹپ خانہ دھری نے ایک قلم میں جنت کے متعلق ظاہر کی ہے کہ :

کیا ہے جنت، چند حوریں، ایک چمن دو ندیاں
ہم نے ایک بار کہا بھی کہ آپ نے محض اس لئے کہ آپ کو وہاں نہیں جانا
برائی کر دی ہے۔ ورنہ ہمارے خیال میں تو اچھی خاصی جگہ ہے جنت، جہیں کوئی
بھیجے گا نہیں ورنہ ہمیں تو کوئی اعتراض نہ ہو۔ فرمے لگے کیا پتہ میاں۔ وہاں
جانا ہی پڑ جائے۔ آدمی کوئی ہمارا دم تحریر تو ہوتا نہیں، کرانا کاتبین اپنے ذرا پتھر
میں جو جی چاہے لکھ دیں، جو جی چاہے حذف کر دیں۔

جنیوا میں کسی نے مشورہ دیا کہ حضرت! ہوائی جہاز سے سوئٹزرلینڈ نہیں
دیکھا جاتا اور پھر حسنی ویر میں تمہاری بس ہوائی اڈے تک پہنچے گی یا ہوائی اڈے

سے دوسرے شہر کے ٹرمینل تک پہنچائے گی۔ اتنی دیر میں تم سوئٹزرلینڈ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جاؤ گے۔ اور پھر برن نہ دیکھا تو کچھ بھی نہ دیکھا۔ ہم نے کہا اچھی بات ہے۔

ہم نے ہوٹل ماں ماں ساں کو خیر باد کہی اور پون بجے کی ایکسپریس پر آئی سوار ہوئے۔ شہر سے نکلنے ہی منظر بدل گیا۔ واہنے اتھ تھیل کبھی چھپ جاتی تھی، کبھی دکھائی دے جاتی تھی۔ بائیں طرف چراگا ہوں اور سبزہ زاروں کے سلسلے شروع ہو گئے اور ان میں فاصلے فاصلے سے خوبصورت چھوٹے چھوٹے پرانی وضع کے گاؤں پھر لڑائی آیا۔ یہ بھی خوبصورت شہر ہے لیکن ہمیں تو گاڑی میں بیٹھے بیٹھے کچھ چاہئیں اس کا وہ چہرہ جو ہماری طرف کو تھا بس یورپ کے دوسرے شہروں کی طرح تھا۔ ماڈرن عمارتیں، اشتہاروں کی ریل پیل، ٹریفک کا نور۔ لیکن ان سے گزرے تو وہی سرسبز و شادابی، کبھی گھائی، کبھی داوی، کبھی جنگل، مغرب میں گھاٹی کی دیوار ہے تو مشرق میں نیشب کا سلسلہ ذور جھیں کے پانیوں تک چلا گیا ہے اور اس درمیان میں گاؤں ہیں کھیت ہیں۔ مویشیوں کے ریوڑ ہیں۔ موسم کچھ گدلا سا تھا لیکن کھلی دھوپ ہوتی تو منظر کی شادابی شاید ایسی نہ رہتی۔ خدا جلنے کوئی لوگ ہوں گے جو ان سبزہ زاروں میں رہتے ہوں گے اور پھر ہمیں صحراؤں کا خیال آیا۔ عرب کے صحرا کا۔ افریقہ کے صحرا کا۔ اپنے صحرا کا جہاں آدمی پانی کے قطرے اور گھاس کی پتی کو ترستا ہے اور وہ جگہیں اسی دنیا میں واقع ہیں اور وہ لوگ انہی صحراؤں میں زندگی کے کڑے کو سٹے کرتے سوئٹزرلینڈ دیکھے بغیر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہاں کی گائیں اور دوسرے

موسیٰ بھی موٹے سنڈے نظر آئے۔ ہمارے موسیوں کی طرح بھوکے ننگے نہیں۔
 اب ہمارا خیال جھٹکتا ہوا گودان کی طرف گیا۔ پریم چند کی طرف گیا۔ پریم چند کی جیم بھوم
 کی طرف گیا۔ جہاں کال کے بادل ایک بار پھر منڈلا رہے ہیں۔ ہم جھر جھری سے کراہک
 بار پھر سوئٹر لینڈ میں آگئے۔ اے آنکھو! یہ سب دیکھ لو۔ جانے پھر کب آنا ہو۔ کبھی
 آنا ہو کہ نہ ہو۔ پھر سحر ہونہ ہو کسے معلوم؟ اور جب ہماری آنکھیں اس حسن اور
 سبزے کے نظارے سے بالاب بھر گئیں اور چھلک گئیں تو اپنے دوست محبوب
 خزان کا مصرع بار بار زبان پر آیا۔ آنا حسن کیا کر دے؟ آنا حسن کیا کر دے؟

برن سے پہلے گاڑی کچھ دیر کو فرانی برگ کے اسٹیشن پر رکی۔ عین لائین کنارے
 ایک قبرستان تھا۔ دُور دُور تک قبروں اور صلیبوں کا سلسلہ لیکن سب پھولوں سے
 ڈھنسی ہوئی۔ سبزہ نورستہ ان ابدی آرام گاہوں کی نگہبان کرتا ہوا۔ قلم کی کیا مجال
 جو اس حسن کے سحر حلال کو احمطے میں لائے۔

برن میں ہوٹل میٹروپول پہنچ کر ہم نے کونٹر پر کہا ”جلدی سے جہیں مکہ دیجئے“
 پھر ہمیں میسر کو نکھنا ہے۔

کونٹر پر ایک لڑکی تھی۔ بولی: آپ مسٹر سنگا ہیں؟

ہم نے کہا: ”نہیں۔ ہم مسٹر سنگا نہیں ہیں مسٹر اشا ہیں؟“ جنیوا سے
 انٹرنیشنل بیورو آف ایجوکیشن نے فون کر کے ہمارے لئے مکہ ریزرو کر دیا تھا جس
 اب ویر مت کر دو۔

’مٹر سوتے نے فون کیا تھا۔‘

ہم نے کہا: ’مٹر سوتے کو ہم نہیں جانتے، نہ مٹر جاگتے کو جانتے ہیں۔ وہاں تو بس کارڈیل تھیں۔ ہو سکتا ہے ان کے دفتر میں مٹر سوتے کوئی صاحب ہوں؟‘
بولیں: ’اگر آپ مٹر سنگا ہیں اور مٹر سوتے کے فرستادہ ہیں تو چشم مارویشن دل بانٹاد۔ کمزور حاضر ہے۔‘

’ورنہ —!‘

’ورنہ نہیں۔ ہمارے پاس ایک ہی سنگل کمزور ہے۔‘

پہلے توجہ میں آئی کہ دیں کہ وہاں ہمیں مٹر سنگا ہیں۔ سنگا ہماری عزیت ہے لیکن سچ پچ کے مٹر سنگا آگئے تو ناحق فقیحہ ہوگا۔ ہم نے کہا۔ ہم نہیں جانتے آپ جیوفا فون کیجئے۔ یہ نمبر ہے ان سے تصدیق کیجئے۔ جنھوں نے کمزور کو روک دیا تھا۔ انھوں نے فون کیا اور فون کرتی رہیں۔ پہلے نہ جلتے کون فون پر آیا پھر کوئی آؤ آیا۔ پھر کسی اور کو بھیجا۔ آخر کھلا کہ وہ لوگ ہماری ریزرویشن کرانے کا ارادہ تو لکھتے تھے لیکن بس بھول گئے۔

ہم نے کہا: ’خیر! بندہ بشر ہے۔ لیکن ہمیں کمزور چاہیے۔‘

بولیں: ’ڈبل روم ہے۔ سنگل تو ہے نہیں۔‘

ہم نے کہا: ٹھیک ہے۔ ڈبل روم ہی دیکھتے۔ ہوٹل ایسا پر رعب اور شان شوکت والا ہے کہ ہم نے بھاؤ تاؤ نہیں کیا۔ آج کی رات تو سوئیں گے۔ فرے کریں گے۔ کل بل دیتے وقت دیکھا جائے گا۔ اصل میں ہم البرز ہوٹل اور ماں ساں ساں ہوٹل قسم کے ٹھکانوں میں رہتے فنگ آگئے ہیں۔ اب یہ اتنا کشادہ کمزور ہے جس میں

ہم چنگ پر آلتی پالتی مارے بیٹھے لکھ رہے ہیں۔ ہوٹل ساں ساں میں تو رات کو جونی واماں خیال یار کو کپڑے کے لئے کروٹ بدلی زمین پر آ رہے۔ ہم نے خود ہی بیرو والوں سے کہا تھا کہ اب کے ہمارے لئے کوئی فٹ کلاس ہوٹل مقرر کیجئے گا۔

بولے: "میٹر دپول اچھا ہے لیکن منگا ہے۔"

ہم نے کہا: "آپ کیا سمجھتے ہیں۔ ہم کھلتے پتے آدمی ہیں۔ لہذا ہمارے شیٹس کا خیال کرو۔"

فرمایا تو ہٹن دیگرہ میں آپ کے لئے کمرہ مع غسل خانہ ریزرو کرادیں۔

اب ہم کچھ ڈر گئے۔ ہم نے کہا۔ ہٹن دیگرہ سے ہمیں وحشت ہوتی ہے شور بہت رہتا ہے اور غسل خانہ کی حاجت نہیں۔ آج کل سردیاں ہیں ہمیں حکیم نے نہانے سے منع کر رکھا ہے اور فٹ کلاس کا مطلب ہے ہمارے حساب سے فٹ کلاس۔

اس پر ان لوگوں نے میٹر دپول کر دیا۔ یعنی کرنے کا وعدہ کیا۔ ہم نے سوچا تھا کہ سنگل روم ہوگا۔ آخر کہاں تک منگا ہوگا۔ ڈبل روم کی ہم نے سوچی ہی نہ تھی۔ لیکن ہمارے ساتھ پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا ہے۔ اسے موقع پر ہم آدھی رات تک ایک بستر پر سوتے ہیں۔ باقی رات دوسرے پر لوٹ لگتے ہیں۔ ناشتہ غائباً ایک ہی طے گا۔ کم ہوا تو اپنے غیر حاضر پارٹنر کا بھی منگا کر کھائیں گے۔ کیوں کہ ہوٹل ساں ساں والوں نے تو کمال ہی کر دیا۔ بس ایک چھوٹی سی پاپا نما روٹی ٹپتے تھے۔ مکھن بھی بقدر اشک بیل، ذرا سا مار عیڈ۔ اب ہمیں مسر داسن یاد آئیں کہ دو انڈے دیتی تھیں۔ بے شمار توموں اور مکھن مرے کے علاوہ کارنی فلیک اور

دودھ بھی۔ پھلوں کے رس کا گلاس بھی وہاں ت گرے تو جرمی میں باقی ٹھیک ہے
ہاں انڈہ اپنے پتے سے کھایا۔ ایسٹرڈم میں ممکن اور پیئر اور تساقتم کی میٹھی پھسکی
سلے دار روٹیوں کا ڈھیر جنیوا میں تو کئی بار ہی چاہا کہ ساتھ ولے کی پلیٹ سے
نظر بچا کر روٹی اٹھالیں۔

کسی شہر سے رخصت کی شب ہمیشہ ہم پر بڑا اثر چھوڑتی ہے۔ ایسٹرڈم
سے ہمیں علی الصباح چلنا تھا اور چھ بجے اٹھنا تھا۔ رات بھر بارش ہوتی رہی پانچ
بجے سامنے سڑک پر گانے کی آواز آئی۔ تین لڑکے اور دو لڑکیاں چھڑیاں تانے
ایک مکان کی سیڑھیوں پر بیٹھی الپ کر رہی تھیں I LOVE TO KISS YOU
آواز میں اُبتی ہوئی جوانی اور بے فکری۔ جلنے کون لوگ ہوں گے کہاں
کے ہوں گے۔ پھر وہ ناپچنے لگے۔ ہم نے اپنا دریچہ کھولا۔ دھم رگشنی کی تو وہ
لوگ متوجہ ہوئے۔ اے مسافر کہاں کے رہنے والو ہو تم۔ ہم نے جی میں تو کہا کہ تم
جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں۔ لیکن یوں خاموش رہے۔ اب وہ بوسے کو فسی
زبان بولتے ہو۔ اب پھر ہم نے اپنے آپ سے کہا کہ دل کی زبان بولتے ہیں۔ اور
بھگتے ہیں اور جی چاہتا ہے کہ تم سے آن میں۔ کیوں نہیں تم لوگ یہاں آجالتے اس
گرم بستر میں آرام کرتے اس بے خانقانی سے چھٹکارا پاتے۔ کوئی جواب نہ پا کر ان
لوگوں سے اپنی حدی کو تیز تیز اور اپنی نوا کو بلند تر کر دیا۔ دل کو کئی کہانیاں یاد سی
آکے رہ گئیں۔ اے بیقرار روح! ہم تمہارے ہیں تمہارے ساتھ ہیں۔ اب ہم
نے دریچہ بند کر لیا مگرے کا بھی، دل کا بھی، آنکھوں کا بھی، جلنے کب وہ لوگ رستے

پانی میں کہاں رخصت ہو گئے۔ دوبارہ آنکھ کھولی تو سناٹا تھا۔

جینوا کی آخری رات ہم نے دریا پار سنہری کلسوں والے روسی گرے کا چکر کاٹ کر یونیورسٹی کے باغ میں سے ہوتے ہوئے نئے چوک سے پردی نیڈ ڈی لا تری کی سیرگاہ میں ٹھیکری لی۔ گھائی چڑھ کر ان ٹیڑھی میڑھی تنگ و نیم تاریک جگہوں میں گم ہو گئے۔ جن میں اب بھی سولہویں اور سترھویں صدی کی بوباس تھی۔ سب سے پہلے کوچ تیرے آیا۔ وہ حویلی جس میں ۱۸۰۰ میں نپولین اعظم مادام سایوں کے ہاں مکان اترتا تھا۔ یہ چند گز کا کوچہ آگے ایک اور ایسے ہی تنگ کوچہ میں مل گیا۔ دہنے ہاتھ چڑھائی تھی اور بھی گرانڈ رو تھی۔ ۲۵ کے مکان کے سامنے جا کر ہم رک گئے یہاں ملٹن اٹلی سے واپسی پر پاسچو وریو دارتی سے آکے ملا تھا۔ اور آگے تھوڑی دُور چل کر وہنے ہاتھ کا یہ اونچا مکان دیکھئے۔ نمبر ۴۰۲۶ میں دو سو پید ہوا تھا۔ اب لویسے اور نشیب کی طرف آئے جہاں گرانڈ رو ختم ہوتی ہے۔ رودنی لایسے شروع ہوتی ہے۔ نمبر ۲۰ پر یہ اونچی حویلی دیکھ رہے ہیں آپ؟ کبھی یہ شاتو بریاں کی قیام گاہ تھی! اچھالے دفنگاں کی رودحو۔ اس ماسٹر کا سلام لیکن جاتے ہوئے ایک نظر اور دلی پطرس کے کیتھڈرل پر، اس کی پہلی اینٹ ۱۱۵۰ میں رکھی گئی تھی۔ عمارتیں کھڑی ہیں۔ ان جگہوں میں پیدا ہونے والے جوان ہونے والے۔ گھومنے والے ہی نہیں رہے، ہر چیز کو دوام ہے سوائے انسان کے۔ درو دیوار موجود ان کے بننے والے مٹی جو چکے۔ اب چل اے سیلانی دریا پار کرو اور کل کے لئے رخت سفر درست کر۔



برن کی جگہ کا سڑک

برن کی سحر بھری رات

ہم نے پریس کے گرجوں اور اسٹینبول کی مسجدوں کو تحیر سے دیکھا ہے تو نری ڈیم۔ کوئون کا کلیسا۔ آیا صوفیہ کا گنبد۔ مسجد سلطان فاتح۔ خدا نے دکھایا تو اور بہت کچھ دیکھنا باقی ہے لیکن قرون وسطیٰ کے جس آئینے اور الف بیلوی ماحول میں آج برن کی گلیوں میں اس تنہا نے گشت کی ہے۔ اس کا بیان محال ہے۔ آج بہت دن بعد چاند نظر آیا جانے کس تاریخ کا ہے۔ برن کے بازاروں کے پرانے محرابی راستوں میں جانے کہاں سے چلے کہاں جا نکلے۔ کھاک ڈاؤس سے آگے گزر کر سڑک کا نام پڑھا۔ اچھا تو یہ کوام گا سے ہے۔ یہاں مارکیٹ گا سے کی سی چل پہل نہیں ہے۔ شب اترنے لگی ہے۔ لوگ رخصت ہونے لگے ہیں۔ کاریں موٹریں بھی اٹکاؤ کا گزر رہی ہیں یہ بھی پکی اینٹوں کا راستہ ہے۔ عین سڑک بیچ وارے کا مینار آگیا جس پر کوئی پکیر بھی بنا ہوا ہے اب سڑک کی اترا تلی شروع ہو گئی ہے۔ دیکھتے کہاں تک جاتی ہے۔ دور وہ مجرا ہیں ہی مجرا ہیں۔ دونوں طرف چیزیں بیچنے والوں کی دکانیں کہیں کوئی چلتے خانہ بھی ہے یا بیر کا پیسہ پڑا ہے۔ برآمدہ اونچا

ہے تو سڑک پر اتارنے کے لئے میٹرھیاں بنا دی ہیں اور نیچے۔ اور نیچے، یعنی پل کا خاکہ نظر آنے لگا۔ افرہ! نیچے دریا ہے۔ دریا کے ساتھ سڑک ہے۔ چھ چھ سات سات منزل کے مکان ہیں جن کی چھتیں پھر بھی پل کے برابر نہیں پہنچتیں۔ اس اونچائی سے کاریں اور چلتے پھرتے لوگ بھی چھوٹے محسوس ہوتے ہیں۔ اب پل کا سرا آگیا لوٹنا چاہیے۔ واپس کرام گا سے۔ لیکن نہیں۔ یہ بائیں ہاتھ کی ویران گلی دل کو کھینچ رہی ہے۔ جگر ن گا سے۔ یہاں تو قدامت کی چھاپ کچھ اور گہری ہے۔ موٹے آثار کی چوڑی اور نیچی گول محرابیں۔ وہی کہ اصفہان کے مسقف بازار میں متی ہیں لیکن ان کی نسبت پست۔ تین صدی پہلے کی تو ہوں گی۔ سناٹا۔ کسی پراسرار فلم کا سائین ہے۔ روشنی بھی کم کم۔ کہیں کہیں کوئی دوکان کھلی بھی ہے لیکن گاہکوں کے لئے نہیں دکاندار بیٹھا دن بھر کی کمائی کا حساب جوڑ رہا ہے۔ بچپوں کے سایے عجیب عجیب شکلیں بنا رہے ہیں۔ لیچے کھلا احاطہ آگیا اور چند سو برس صدی کے مشہور گر جانا سیدگ کرک کی پشت۔

میاں سے ایک تنگ میٹرھیوں کا سلسلہ نیچے کہیں اتر گیا تھا ان نیم تاریک میٹرھیوں میں بے سمجھے اترنا ہے خطرناک جلتے کہاں پہنچا دیں لیکن دیکھا جلتے۔ ۵۔ میٹرھیاں، پھر موڑ، پھر ۴۰ میٹرھیاں، پھر موڑ۔ لگے موڑ کے بھجے سے قدموں کی چاپ آ رہی ہے۔ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ ہم جیسا خدائی خوار۔ لگا گھونٹنے والا۔ نہیں یہ تو کوئی طالب علم سا لگتا ہے بغل میں کتابیں ہیں۔۔۔ نیچے کبار دریا کی آبادی سے آ رہا ہوگا۔ اٹھا موڑ۔ لیکن یہ تو لا متناہی سلسلہ ہے اب واپس اب قدموں کی چاپ اوپر سے آئی شروع ہو گئی۔ نیچے کے راستے میں اب کوئی نہیں

ہے کیونکہ صدیوں پرانی ان بوسیدہ میٹریوں پر تھوڑی سی آہٹ بھی بہت گونجتی ہے۔ ہم اس رستے کے اُدھر میں ہوں گے۔ اب اوپر کی چاب قریب آ رہی ہے۔ کھٹ کھٹ کھٹ۔ ارے یہ تو کوئی لڑکی ہے۔ ارے لڑکی تو اس دیرانی اور نلٹے میں کہاں سے آگئی کیا تجھے کسی کا ڈر نہیں؟ نیچے کنارہ دریا پر کس کی کشش تجھے لے جا رہی ہے۔ کھٹ کھٹ کھٹ۔ خوشبو کا ایک جھونکا پاس سے گزر بھی گیا۔ اوپر گر جا کا احاطہ۔ احاطے میں پھولوں اور پودوں کی ریش کونوں پر شش پہلو سرخ محافطوں کی کوٹھڑیاں دودھ احاطے کی دیوار، اس کے ساتھ دوسلے دودھ باش لے اجنبی ان کے رنگ میں جھٹک نہ ڈالنی چاہیے۔ اب ذرا دیوار کی منڈیر پر جھک کر نیچے دیکھو۔ بار خدایا۔ کیا منظر ہے! دریا راتے ملاں۔ دیرپے۔ دیرپوں میں روشنی، روشنی میں لوگ۔ اچھے لوگ، بُرے لوگ، شاد لوگ، ناشاد لوگ اپنے آپ میں گم۔ دوسرے انسانوں کے غموں اور خوشیوں سے بے پروا۔

اور اے گرجا۔ تو جو پانچ سو سال سے سر بلند کھڑا ہے۔ تو نے کس کس گمناموں کو دیکھا ہے یہ تیرے ماتھے پر غنیمتوں کا حال کیسا ہے! ادھر بچتے جلنے والوں کے پکیروں کا جھوم ہے۔ ادھر مقہورین اور مغضومین کا۔ انوہ گیارہ بیچ گئے کیا؟ پہلے سریلی گھنٹوں کا سلسلہ پھر گھن گرج، اچھا رخصت۔ لوگ آئیں گے دیکھیں گے چلے جائیں گے۔ تو یونہی پانچل کھڑا گرج بجاتا رہے گا۔ اے عظمت استادہ ہم فانی ہی سہی لیکن تجھ سے مجبور نہیں۔ دُور دور کی منزلوں میں قدم ماریں گے۔ اور

وہاں جا آرام کریں گے۔ جہاں سب آرام کرتے ہیں۔ ہم تیرے شکوہ اور سر بلند کا پر
 تحیر ضرور کریں گے۔ لیکن رشک نہیں، پانچ سو برس تک کوچہ جلکن لگا سے کی
 اداس محرابوں والی گلی اور دریا کے درمیان بے حس و حرکت کھڑے رہنا ہمیں
 منظور نہیں۔ ہرگز منظور نہیں۔

زیورخ تک براستہ ٹھنڈہ

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جہاں ہم جس ہوٹل میں شہر میں آس پاس مرمت کا کام بہت نکل آتا ہے۔ جنیوا والے ہوٹل کے سامنے ٹرنگ برائے مرمت بند ہے۔ کابورڈ لگا ہوا تھا۔ اور دن بھر جنیوا کے کسے ڈی اے والے خاک اڑاتے رہتے تھے۔ برن میں ہماری آمد کی اطلاع پاتے ہی ان لوگوں نے ایک بہت اونچی سی کیرین ہماری کھڑکی کے سامنے لا کھڑی کی اور شب بھر گڑگڑا دھڑ دھڑ ہوتی رہی۔ ایسٹریڈم کے ہوٹل کے ساتھ ہی ان دنوں ایک شخص کو اپنا پرانا مکان ڈھکا کر نیا بنانے کی سوچھی تھی۔ ایک آدھ جگہ کی تو خیر تھی لیکن ہر جگہ ہر شہر میں اس کا التزام محض اتفاق کہہ کر نہیں ٹالا جاسکتا۔ مرمت کے ذکر پر یاد آیا کہ کام تو رفوکا ہمارے دل میں بھی بہت ہے لیکن کاریگر اس کے پاکستان میں ہیں۔

برن میں دو مری صبح ہر طرف دھند ہی دھند تھی لیکن ہمارے پاؤں میں چکر۔ نو بجے چل نکلے سب طرف سڑکوں اور موٹرروں کی جیاں جل رہی تھیں۔



زوریک — دریائے زوریک کا ساحل

کھاک ٹاور کے پاس سے نکل کر چن فیلڈ ہل سے دریا پار کیا تو سامنے برجوں والا ایک قلعہ نظر آیا۔ اور اس کے سامنے چوک میں محبوسوں کا ایک سلسلہ۔ لیکن ہماری منزل ایک لائبریری تھی۔ لہذا حلو تیا اسٹریٹ پکڑی اور ایک دو جگہ جھٹک کر اوپر پونچھ کر منزل پر پہنچ گئے۔ یہاں ہمیں کچھ ایسا کام نہ تھا بس دیکھنا تھا۔ ہم نے جاتے ہی تعارف کرایا کہ ہم صاحبِ علم آدمی ہیں کئی خطوط ملے وغیرہ ہوں تو دکھا دو معلوم ہوا کوئی نہیں جرمن زبان کی کتابیں ہیں۔ وہ بھی حواسے کی۔ ہم نے کہا اچھا یہ بات ہے تو سلام علیکم خدا حافظ۔

لیکن لائبریری میں رہ جہہ ہمیں یوں مست چھوڑنے والی نہیں تھیں انھوں نے ہمیں یونین کینڈاگ کی تفصیل بتانی شروع کی۔ پھر میڈیکل روم دکھایا اور کہا

اس میں بیٹھ کر لوگ پڑھتے ہیں پھر وہ خلتے وکھلتے جن میں انڈس کا رڈ رکھے تھے۔ پھر کہا۔ اوپر چلو۔ قطار در قطار کتابوں کی الماریاں بھی دکھاؤں۔ ہم نے کہا ہم نے سب سمجھ لیا۔ بہت اچھی لائبریری ہے! اللہ اس کی عمر ورازا کرے۔

فرمایا۔ میں نے اپنی بات تو ابھی پوری نہیں کی۔ اور پھر انھوں نے اپنی بات پوری کرنی شروع کی۔ یونین کینڈاگ۔ یونین کینڈاگ۔ یونین کینڈاگ۔

گاڑی تو ہماری ایک بچے جاتی تھی لیکن اس سے پہلے ہم وہ عجائب گھر دیکھ لینا چاہتے تھے جو پاس کے چوک میں واقع تھے۔ پھر ہمیں کلاک ٹاور جا کر گھنٹہ بجتے دیکھنا تھا۔ پھر ہمیں وہی کل رات والا پل پار کر کے ریکھپوں کا بھٹ دیکھنا تھا اور وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔

ہم نے پھر کہا۔ ہم اس لائبریری کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ خدا حافظ۔ فرمایا: آپ نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے آپ کو جو من کے پڑنے رسالوں کے فائل دکھاؤں۔

اوریوں ان کے اصرار اور ہمارے انکار میں ایک میوزیم کا تو وقت نہ رہا دوسرے کے لئے ہمارے پاس کلمہ سات منٹ بچے۔ خیر ہم لوگ گردپوش پڑھ کر کتاب پر فاضلانہ دیولویو کرنے ولے ہیں۔ ان سات منٹ میں برن کے ہسٹری اینڈ آرٹ میوزیم میں دلکھی ہوئی چیزوں کی ہسٹری پر عبور حاصل کر کے اور آرٹ کے شاہکاروں کی مین میکھ نکال دیربان سے اپنا اور کوٹ لے تھینک یو کہ باہر آگئے۔ ایک طواف محسموں کا بھی کیا۔ اس میوزیم میں ہمارے

نزدیک سب سے طرفہ چیز تو اس کی عمارت ہے۔ یہ وہی برجوں والا قلعہ تھا جسے ہم نے جاتے ہوئے دیکھا تھا تو نہ جلنے کیا سمجھا تھا۔ یہ ساری جلدی اس بات کی تھی کہ بارہ بجے کلاک ٹاؤر پہنچ جائیں۔ اس کلاک ٹاؤر میں جب گھنٹہ پورا ہونے کا وقت آتا ہے تو ریچھوں اور ٹھٹھڑوں کی ایک قطار گھومتی ہوئی نکلتی ہے اور ڈیوک زارٹمن کا بت دونوں ہاتھوں سے گھڑیالی بجاتا ہے۔ یہ طرہ تماشا دیکھنے کو جو نہ جانے کب سے جاری ہے دُور دُور سے لوگ آتے ہیں۔ ہم نے بھی جب تک یہ نہ دیکھ لیا۔ کلیئر ٹھنڈا نہ ہوا۔

اب ہم نے پھر کل رات والا راستہ پکڑا۔ کرم گھاٹ اور اس سے آگے پرانا پل اور گرجا اور پھر ریچھوں کا بھٹ۔ یہ کچھ اس شہر کا نشانہ ہے۔ بھٹ سے پر ریچھ، مہر پر ریچھ، ڈھال پر ریچھ۔ کہتے ہیں ڈیوک آف زارٹمن نے یہ شہر بسانے کا خیال کیا تو عہد کیا کہ اس کے فواحیات میں شکار میں جو جانور سب سے پہلے ہاتھ لگے اس پر شہر کا نام رکھا جائے گا۔ اور وہ جانور ریچھ تھا۔ پل پار کرنے پر دھننے ہاتھ کو ایک گرا بھٹ لے گا جس میں ریچھ رکھے گئے ہیں۔ بلکہ دو بھٹ ہیں جن کے گرداگرد جنگلی ہیں۔ ایک میں بڑے ریچھ۔ دوسرے میں ان کے بچے یہ ریچھ کے بچے بڑے کلنڈر سے اور معصوم صورت ہیں۔ لوگ ان کو دیکھنے دُور دُور سے آتے ہیں۔ کسی کو اوپر کھڑا دیکھتے ہیں تو پھلے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سلام کرتے ہیں۔ مانگتے ہیں کہ ابھی انعام ملے گا۔ کوئی اوپر سے گا جری پھینکے گا۔ زیادہ تر تو بے چاروں کی محنت رائیگاں جاتی ہی دیکھی گجریں تو ہم بھی نہ لائے تھے۔ سو چا پیسے پھینک دیں خود ہی خرید کر کھالیں گے۔ پھر

برن کا گھڑاگ ٹاور



باز رہے، کہ وطن پہنچ کر ہم بھی نظیر اکبر آبادی کی طرح ریکھ کا بچہ پانے کی
کوشش کریں گے۔

برن سے ریل میں بیٹھے تو پھر وہی خوبصورت واوایاں چراگاہیں چھوٹے
چھوٹے مکان چہرتے ہوئے موریٹی، اور جنگل اور پرہت۔ دامن میں کوہ کے
اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو، کی تنا کرنے والا شاعر اقبال ان راستوں سے کئی بار
گزرا۔ کیا عجب انھی مرغزاروں اور کساروں نے اس سے یہ نظم لکھوائی ہو۔
ہو ہاتھ کا سر ہانا بننے کا ہو بھونپڑا پانی بھی موج بن کے اٹھ اٹھ کئے لکھا ہو
اس خاموشی میں جایتیں اتنے بلند نلے تاروں کے قافے کو میری صدا دے ہو
پرہت، نیلا پرہت، احمد بشر، خیال بھٹکتا ہوا کہاں کہاں جا نکلا۔

سامنے کی سیٹ پر ایک بڑے میاں بیٹھے تھے پہلے انھوں نے ہم سے
جرمن میں گفتگو شروع کی۔ جواب باصواب نہ ملا تو فریخ پڑے۔ ہم نے یہ وار بھی
خالی دیا تو شاید اٹالین شروع کی آخر ہم نے اردو میں کہا مہا بایہ فرنگی بولیاں
ہیں نہ آویں۔

گفتگو ریختے ہیں ہم سے کہ
یہ ہماری زبان ہے پیارے

آخر وہ ایک دوسرے بڈھے سے گفتگو میں جٹ گئے جو ان کی بات کا
جواب دے کر سو جاتے اور ایک خراٹا لے کر پھر اٹھ جاتے۔ باتیں وہ اس
ہمارے سامنے والے بڈھے سے کرتے تھے۔ دیکھتے یہاں رہتے تھے۔ ہم اور

تو کیا بولتے۔ ہونکارا بھرنا شروع کر دیا۔ یا۔ یا۔ یعنی ناں، ناں، بجا
نفرمایا۔ بجا فرمایا۔

اب اولٹن آگیا۔ یہ ایک جنگش ہے برن اور زیورخ کے درمیان۔ یہاں
ہم نے اتر، سامان امانت رکھوا، اپنی منزل کا پتہ پوچھنا شروع کیا۔ سارے
میٹ فارم پر ایک بھی شخص انگریزی سمجھنے والا نہ ملا۔ اس پر ان لوگوں کو دعویٰ
مذہب ہونے کا ہے۔ کوٹ پتلون پہنے پھرتے ہیں۔ آخر معلومات کے دفتر
میں گئے۔ پتہ چلا یہ پل پار ہی ہماری منزل ہے۔ اس کے باوجود ہم تھوڑی دیر
تک بٹھکتے پھرے، کچھ دانستہ کچھ نادانستہ۔

برن سے چلتے ہیں ہم نے ایک جگہ کافی پی تھی اور ساتھ میٹھے بسکٹ کھا
لئے تھے۔ گاڑی ہماری پونے تین بجے پہنچی۔ ہم نے سوچا جن صاحب سے ملنے
جارہے ہیں وہ اس وقت تو خیر کافی بلائیں گے، اس کے ساتھ ہی بسکٹ ایک
دیگرہ۔ پھر ہم گفتگو کریں گے، تو بے تکلفی بڑھے گی۔ پھر وہ کہیں گے۔ ع
کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات

ہم کہیں گے۔ نہیں نہیں۔ کیا تکلف ہے، ہم زیورخ پہنچ کر کھالیں گے
وہ کہیں گے۔ واہ! ہم کھانا کھائے بغیر جانے نہ دیں گے۔ بلکہ ہمارا تھیلا اٹھا کر چھالیں
گے۔ آخر ہم ہتھیار ڈال دیں گے۔ کہا پی والے بہرے کی طرح ہم یہ مکمل نہ سوچتے
ان کے در دولت پر پہنچے۔ ان کی سیکرٹری نے کہا، وہ معروف ہیں۔ ہم کچھ خفیف
سے ہو کر بیٹھ گئے، اور کتابیں دیکھنے لگے۔ آدھے گھنٹے بعد ان کی سیکرٹری پھر

آئین اور بولیں، نیچے کی منزل میں کچھ کتابیں اور رکھی ہیں، وہ بھی چل کر دیکھ لیجئے کیونکہ مسٹر فلاں ابھی تک مصروف ہیں۔ ایک صاحب سے گفتگو کر رہے ہیں۔ اس کے بعد آپ سے ملیں گے۔

آخر مسٹر فلاں ملے۔ بڑی اچھی طبیعت کے آدمی ہیں۔ انہیں کچھ معلومات درکار تھیں جو ہم میا کرتے رہے۔ پھر ہم نے کچھ پوچھا۔ انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے جواب دیا۔ ہمارے پیٹ کی کھربد ہمیں نڈھال کئے دے رہی تھی لیکن اس اٹھ کے بندے نے ہم سے اسکول ہی کی بات کی۔ یہ نہ بتایا کہاں رکھی ہے دونی رات کی۔

یہ رنگ ڈھنگ دیکھے تو ہم نے پونے پانچ ہی بجے اجازت چاہی۔ انہوں نے کہا۔ اچھا تو آپ جائیں گے۔ یہ کہہ کر دروازے تک چھوڑنے آئے۔ گاڑی ہماری سواچھ بجے چلتی تھی لیکن ہم ڈگ بھرتے اسٹیشن پہنچے۔ باہر ایک بڑگ پھل والا کھڑا تھا۔ اس سے مونگ پھلی لی اور اندر جا کر پوچھا۔ کوئی گاڑی ہے زیورٹ جانے والی اس وقت۔

جواب ملا: سیدھی گاڑی سواچھ بجے جائے گی۔

ہم نے کہا: سیدھی الٹی سے مطلب نہیں۔ ہم فوراً جانے والی گاڑی مانگتا ہوں۔ ٹکٹ بابو نے کہا: ہاں پانچ بج کر تین منٹ پر ایک گاڑی جاتی ہے۔ لیکن منہر ہے۔ بڑا چکر کاٹ کر برگ کے رستے جائے گی۔ اور قریب قریب اس وقت پہنچے گی۔ جب سواچھ والی ایکسپریس ٹرین۔

ہم نے سامان لیا اور پلیٹ فارم ملے کی طرف ایک جست کی۔ گاڑی نے بھی

ہمیں روکنے کی بہت کوشش کی کہ یہ پنجر ہے اس میں مت بیٹھو لیکن ہم نے مان کر نہ دیا اور کہا یہ راز یورخ کا ٹکٹ۔ اگر اور پیسے بنتے ہیں تو بولو۔ لیکن اولٹن اسٹیشن پر بیٹھ کر انتظار کرنے کی بجائے چلتی گاڑی میں بیٹھے رہنا اچھا۔ اور یوں ہم نے براستہ جھنڈہ جانے والی پنجر ٹرین میں مؤلک پہلی ٹھونکتے سفر کیا۔

جو لوگ دیہات یا چھوٹے قصبوں میں بڑھے پئے نہیں وہ برا رخ لائوں اور پنجر گاڑیوں کا لطف کیا جانیں۔

یہ گاڑی بھی ذرا سا چلتی تھی اور رُک جاتی تھی جیسے جھوٹے کی بیماری ہو۔ مسافر آکے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے۔ پہلے اسٹیشن سے بچے سوار ہوئے

دوسرے سے دیہاتوں کا ایک خول میٹوں پر پھسکڑے مار کر بیٹھ گیا اور گھبراہٹ لکھانے لگے۔ اب ہمیں اپنی گاڑیاں یاد آئیں۔ محمد باندھے ہوئے بڑھے ان کے

بچے اور گھڑیاں۔ کسی میں گڑ، کسی میں چاول، کسی میں تبا کو کسی نے نئی ہنڈیا یا ایو منیم کی پرات خریدی ہے۔ کسی کے پاس نئی چنگیر ہے۔ تو لے میں نلک کے ڈبے بندھے ہیں۔ قصبے میں خریداری کرنے آتے تھے۔ جن عورتوں سے میٹوں پر بیٹھا

نہیں گیا۔ وہ فرش پر یا کسی ٹرک پر بیٹھ گئیں اور بچنے والے نکال کر کھانے شروع کئے۔ اب گاڑی کھڑی ہے اور کھڑی ہے کیونکہ کسی اور لاڈلی گاڑی کو پہلے گزانا

ہے۔ ایک بڑے میاں نے فرش کے کونے کھدروں سے کاغذ اور تنگے جمع کئے۔

اور فرش پر آگ جلا کر سوتہ بھرا۔ کوئی ہمت والا دوڑ کر گیا اور پاس کے کھیت



سے گئے اکھاڑ لایا۔ اور اب گاڑی کے اندر ہی چھکوں کا ڈھیر لگ گیا ہے۔ ابھی ان کی منزل دُور ہے۔ کوئی اگلے سٹل پر اتر جائے گا۔ کوئی اسٹیشن پر پھر کوئی بہت طرہ باز خاں ہوا تو تا تک ڈھونڈے گا ورنہ سامان کی ٹھہریاں ٹرنک دیکھتے سر پر رکھے، بقیہ بھلوں میں داب شام کے چھٹے میں کھیتوں کی پگڈنڈیوں میں گاؤں کی راہ لیں گے۔

پھر گاڑی کھڑی ہو گئی اور ہمارے تصور کی اُکھ کھل گئی۔ ہمیں تو یہاں کے دیہاتی اسٹیشنوں پر بس ایک ہی آدمی نظر آیا۔ اسی نے جھاگ کر کاٹا بدلا۔ اُسی نے بھنڈی دی۔ اسی نے لوگوں سے ٹکٹ وصول کئے۔ غالباً اسٹیشن ماسٹر ہوگا۔

ہمارے ان بغیر ٹکٹ سفر کرنے کی عادت عام ہے۔ ہم نے بھی بچپن میں کئی بار کیا ہے۔ یہاں کے لوگ بلا ٹکٹ سفر نہیں کرتے اس کی ایک وجہ تو ان کی طبعی ایمانداری ہے۔ دوسری شاید یہ ہو کہ چکنگ بڑی سخت ہے۔ اسٹیشن چھوٹا ہو یا بڑا ہو چکر ضرور آئے گا۔ اور ٹکٹ میں سودا خ کرے گا۔ زیورخ کے قریب پہنچتے پہنچتے پندرہ جگہ ٹکٹ کر ہمارے ٹکٹ کا یہ حال ہوا تھا کہ پڑھانے جاتا تھا کہاں کہاں ہے اور ٹکٹ ہی ہے یا کچھ اور۔ زیورخ سے دو اسٹیشن اور صریہ آخری بار کٹا اور ختم ہو گیا۔ اگلے اسٹیشن پر ہم نے چکر سے کہا کہ وہ جس پر آپ اپنی مشق ناز کرتے تھے وہ تو نہیں رہا۔ اب میری انگلی اس آسے سے کاٹ لیجئے۔ اور زیورخ میں مجھے یعنی دروازے سے نکال دیجئے گا کہیں کوئی بلا ٹکٹ سمجھ کر پکڑے۔

جرمنی میں ہالینڈ میں سوئٹزرلینڈ میں ٹراموں اور بسوں کا بھی یہی دستور ہے۔
 ہماری ٹرام کی طرح بیسیوں دروازے نہیں کہ چکر ڈال ڈال اور مسافریات پات
 ادھر ڈوبے ادھر نکلے۔ بس ایک دروازہ ہے۔ اس میں سے آئے ٹکٹ باؤ کے
 سامنے سے گزریئے وہ ہر ایک کو ٹکٹ دے گا یا چیک کرے گا۔ جب جی چاہے
 گا ایک بٹن دبا کر سارے دروازے بند کر دے گا۔ جب چاہے گا کھولے گا۔
 ایک بڑے میاں بندوق لئے اپنے خربوزوں کے کھیت پر پہرہ دے
 رہے تھے۔ ایک راہ گیر نے کہا۔ کیسے ہیں یہاں کے لوگ؟ بڑے میاں
 بولے بڑے ایماندار ہیں۔ کیا مجال جو میرے خربوزوں کو ہاتھ لگائیں۔
 راہ گیر نے کہا یہ بندوق آپ نے کیوں سنبھال رکھی ہے۔ بڑے میاں
 بولے ان کو ایماندار رکھنے کے لئے۔

اس ایک جواب میں یورپ والوں کی ایسا نداری کی خاموشی آجاتی ہے
 پوری نہیں تو بڑی حد تک۔

چترپرس

۱۲ / دسمبر ۱۹۶۷



شامتِ اعمالِ ماصورتِ پیرس گرفت

زیورخ سے جہاز اچھا خاصہ سیدھا پرانگ جاتا تھا لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے شامتِ اعمالِ ماصورتِ پیرس گرفت۔ ہم نے سوچا جلدی کیا ہے۔ اتوار کی صبح پیرس چلے جائیں۔ ایک شام اور شب وہاں گزاریں دوستوں سے مل لیں۔ پیر کی دوپہر پرانگ روانہ ہو جائیں گے لہذا ایک جرمن دوست کو جو پیرس میں رہتے تھے۔ ایئرپیرس تار سے مطلع کیا کہ ہم نزلِ اجلال فرما رہے ہیں۔ ہمارے لئے کوئی مناسب ہوٹل مقرر کر دو۔ اور ہاتھ کو پاکستانی سفارت خانہ میں فون کر دو کہ رات کو اپنے سامن میں تھوڑا پانی اور ڈال لے اور بازار سے دو روٹیاں نا تو منگے۔

سوئٹزرلینڈ کے لئے ہمیں جو جیب خرچ ملا تھا وہ ہفتے کی شام تک کفایت ہو چکا تھا۔ زیورخ میں ایک شب اور ٹھہرتے تو ساڑھے سترہ فرانک اور جتنے پھلی بار ہوٹل ملا رہیں ہم پچیس فرانک دیتے تھے۔ بعد میں تو ایک پاکستانی نامی مشفق نے بتایا کہ تم تو ٹھہر رہے ہو۔ میں تو پیرس میں ہیں یونیسکو کے دفتر

کے بٹل میں کوچہ گیری بالڈی کے ہوٹل رزرویو میں پندرہ فرانک میں ٹھہرا تھا بس وہاں چلے جانا۔ ایک رات کی تو بات ہے۔ اچھا بھلے مانسوں کا ہوٹل ہے۔ البتہ انگریزی وہ نہیں جانتے۔ فریج بولتے ہیں۔ ہم نے کہا مضائقہ نہیں۔ ہم بھی بہت فریج جانتے ہیں، وہ ہم سے زیادہ تصوڑی جانتے ہوں گے۔ احتیاطاً ہم نے اپنے بھٹ میں ہوٹل کے لئے بیس فرانک کی مدد نکالی، ایک وقت کا کھانا اٹم کے ہاں فرض کیا دوسرے وقت کے سینڈوچوں کے لئے پانچ فرانک رکھے، باقی ٹیکسی قلی بس وغیرہ کے لئے آٹھ دس اور ادا رہے یہ تھا کہ پیرس میں اتار کر ہوٹل میں سامان رکھ سیدھا میوزیم نوور کا رخ کریں گے۔ ایک تو آرٹ کے شاہکار دیکھ کر ذہن میں کچھ وسعت اور عظمت میں کچھ نکھار پیدا ہوگا۔ دوسرے پیسے بچیں گے جو بازار میں گھومنے پھرنے کی صورت میں لامحالہ خرچ ہوتے ہیں۔

لیکن وہ جرمن دوست اخلاق کا مارا ہمیں ہوائی اڈے پر لینے پہنچ گیا۔ بولا ہوٹل تمہارے لئے ٹھیک کر دیا ہے۔ مناسب داموں کا ہے اور یونیسکو سے چنداں دور نہیں۔ لیکن اس وقت تو سامان میری کار میں رکھو۔ میرے گھر چلو دوپہر کا کھانا میرے ہاں — شام کے پانچ بجے تک کے لئے میں فارغ ہوں۔ باتیں کریں گے، شام کو تمہارے ہوٹل تمہیں چھوڑ آؤں گا اور ہاں میرا گھر ورسائی کے پاس ہے۔ تم نے ورسائی کا محل نہیں دیکھا وہ بھی دلکھاؤں گا۔

ہم نے کہا ”ہمارا عزم تو نوور کا تھا“

بولے ”نوور“ رات کو دیکھ لینا“

ہم نے کہا ”رات کو کھلا رہتا ہے“

بولے : ہاں۔ رات کو تو نہیں کھلا رہتا :

یہ صاحبِ پاکستان میں رہ چکے تھے اپنے گھر میں انھوں نے پاکستان کے پہلے بدھنے۔ تو سے پڑائیں۔ ایک دو بے ڈول سی ڈھولیاں، کان بھڑی سارنگیاں اور اونٹ کی کھال کا ایک میپ سجا رکھا تھا جس کی کوئی کئی سیدھی نہ تھی۔ بڑے فخر سے دکھاتے رہے۔ ایک کتابھی وہ پاکستان سے اپنے ساتھ لے گئے تھے جس کا نام کراچی خاں رکھا تھا اور اس سے اردو بولتے تھے دہشت اچھا، گرم پانی، بشکر یہ چائے لاؤ وغیرہ) اس سے انھوں نے ہمارا تعارف کرایا۔ ہمارے ہاتھ چٹوائے، ہماری پتلون چٹوائی، ہمارا تھیلیا چٹوایا۔ ہم کتوں کو منہ نہیں لگاتے۔ منہ تو کیا ہاتھ تک نہیں لگاتے لیکن اس وقت ہی کڑا کر کے نہایت خندہ پشانی سے خواجہ مرگ پرست بنے رہے کہ اگر بڑا ہی دکھائی، تو یہ شخص کسے گا کہ دیکھو اس شخص کو پاکستان اور پاکستان کی چیزوں سے اتنی بھی محبت نہیں ہے۔ وہ تو ہم نے باتوں باتوں میں بتا دیا کہ ہم محبت کی ظاہری نمائش پسند نہیں کرتے ورنہ کیا جب ہمیں اور اس کتے کو کھانا بھی ایک ہی پیٹ میں ڈال دیتے کیونکہ وہ پاکستان میں کئی کئی آدمیوں کو ایک ہی پیٹ میں کھاتے اور ایک ہی ڈونگے سے ایک ہی ٹکے میں سے نکال نکال کر پانی پیتے دیکھ چکے تھے اور اسے مستحق بتاتے تھے کہ آپس میں محبت اور اخوت بڑھانے کا عمدہ ذریعہ ہے۔

ورسائی کے رستے میں ہم نے یونی پوچھ لیا کہ یہ ہوٹل جو آپ نے ہمارے لئے پسند کیا ہے، کیا نام ہے اس کا، کیا نام ہیں اس کے ؟

بولے: ”ڈبلی ہوٹل نام ہے۔ پینتالیس فرانک کا ہوگا۔ اس سے زیادہ کا کیا ہوگا۔“

ہم نے کہا: مذاق کو چھوڑیے، پہنچ چکے ہیں۔

فرمایا: مذاق کی کیا بات ہے۔ ۴۵ فرانک کچھ زیادہ تو نہیں۔

ہم نے کہا: آپ کو معلوم ہے ہم کوئی ریسیے تو ہیں نہیں۔ ہمیں کھانے پینے کپڑے، دھوبی، نائی، بس گاڑی یہ وہ سارے اخراجات کس لئے کل چالیس فرانک ملتے ہیں اور اب چونکہ ہم فرانس اپنی خوشی سے آئے ہیں۔ یہ بھی نہ ملیں گے۔ ہمارا انتظام تو پندرہ سولہ فرانک والے ہوٹل میں کیا ہوتا بلکہ لیٹن کوارٹریں تو سست آٹھ فرانک روز والے ہوٹل بھی ہیں۔

بولے: اب تو ہو گیا؟

”۴۵ فرانک۔ ۴۵ فرانک تھوڑا کم یہ کیسے دیں گے۔ کہاں سے دیں گے۔ ہمارا تو سارا اندوختہ پانچ پونڈ ہے یعنی کوئی ساٹھ پینسٹ فرانک اور ابھی اتنا لبا سفر ہے۔“ ہم اس اوجھڑ میں لگ گئے۔ فرمایا۔ یہ سامنے درستی کا عمل ہے۔ اس میں پہلی جنگ عظیم کے بعد وہ معاہدہ ہوا تھا۔ جسے معاہدہ ورسائی کہتے ہیں۔

ہم نے کہا: اچھا ہے، (لیکن یہ ۴۵ فرانک کا کیا ہوگا)

بولے: خوبصورت ہے نا؟

ہم نے کہا: بہت خوبصورت ہے (۴۵ فرانک) کیا کہنے (۴۵ فرانک)



اب انھوں نے محل کے احاطے کے باہر اپنی گاڑی ایک جگہ ٹھہری کر دی اور کہا
اُڑتیں پارک دکھاؤں۔

ہماری آتش شوق اس دوران سرد ہو چکی تھی۔ ہم نے کہا: "نہیں اب
شہر چلیں گے۔" (۴۵ فرانک)

بوسے! واہ پارک دیکھئے بغیر چلے جائے گے۔ یہ دیکھو بیاں سے آکر ذرا منظر
دیکھو کتنی دور تک روشوں کا سلسلہ چلا گیا ہے اور وہ دودھ نہر کا پانی دیکھو ہے ہو!
ہم نے کہا: "نہر کا پانی؟ ہاں ہاں دیکھو رہے ہیں؟" (۴۵ فرانک)

اب وہ بوسے! اب نہیں دوسری طرف کا پارک دکھاؤں۔ ذرا دیکھنا کہ پھوس
اور پودوں کا تناسب کتنا آرٹسٹک ہے اور یہ بُت اور یہ مجسمے!

ہم نے کہا: ”ہاں یہ یث یہ مجھے۔ بڑی عالی شان چیزیں ہیں۔ اب چلیں شہر“
 بوے ابھی نہیں۔ ابھی تو باتیں ہاتھ کا پارک دیکھنا ہے۔

ہم نے کہا: ”نہیں۔ ہم تو اتنا ہی دیکھ کر مبہوت ہو گئے۔ واقعہ بہت ہی
 طبیعت خوش ہوئی (اسے شخص! تجھے تو تنخواہ پیرس میں فرانکوں میں ملتی ہے
 ہمارا تقریر ڈوبو دیا۔ تو نے)

والپس میں ٹریفک کے رش میں خاصا وقت لگا۔ خاصا اندھیرا ہو چلا تھا۔
 جب ہم ہوٹل پہنچے ہیں۔ جرمن دوست نے باہر سی سے ہاتھ ملایا اور رولز
 ہو گئے۔

ہم نے ڈرتے ڈرتے ہوٹل میں قدم رکھا۔ کونٹر پر ایک ترش رُو صاحبہ بیٹھی
 تھیں۔ ہماری زبان سے پورا فقرہ بھی نہ نکلا۔ سب صرف دنگو بھول گئے تھے۔
 ہم نے کہا ”کمرہ۔ ہمارا نام ابن انشا“

بولیں۔ ”اں ہاں سن لیا۔ کمرہ سہ تیار ہے“

”کہتے کا ہے؟“

فرمایا: ”چھیا سٹھ فرانک کا!“

ہمیں یقین نہ آیا۔ دوبارہ پوچھا۔

بولیں: ”ساتھ جمع چھ۔ چھیا سٹھ۔ کمرے کے ساتھ ساتھ روم بھی تو ہے۔“

ہم نے کہا: ”باتھ روم کیوں ہے۔ ہمیں تو بس چھوٹا سا سنگل کمرہ چاہیے

تھا۔ نہانے کا ہمارے سامنے نام مست لو۔ ہم افیم کھاتے ہیں۔ یوں بھی سردی

کا موسم ہے۔ پانی گھلا ہوتا ہے نا :-
 بولیں یہی کمرہ ہے۔ اور کوئی نہیں :-
 ۴۵۰ فرانک کا بھی نہیں ؟
 ”نہیں“

ہم نے کہا :- اگر ہم کسی اور ہوٹل میں چلے جائیں تو ؟
 فرمایا :- شوق سے چلے جائیے۔ لیکن کل ۔ یہ ایک دن کے تو پھیلا سٹھ
 فرانک ہم وصول کریں گے ہی :-
 ہم نے دروازے کی طرف دیکھا وہاں گھنی مونچھوں والا ایک ہٹا کٹا دربان کھڑا
 خشونت سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ ہم نے کہا ہم تو یونہی کمرہ رہتے تھے۔ مذاق کر رہے
 تھے۔ بھلا اور کہیں جانے کا کیا سوال ہے۔ ہمیں تو کوئی کمرہ بھی تو نہ جائیں :-

ڈربئی (ہوٹل) کی ریس کون جیتا؟

کمرہ نمبر ۸۔ ڈربئی ہوٹل۔ ڈربئی کے نام پر ہم گھوڑے کی طرح ہنہناتے اپنے سوٹ کیس پر دو لٹی بھاڑی۔ ٹھسی ہوئی درمی۔ ٹیڑھی دیواریں۔ کمرے کے دو حصے تھے۔ دونوں میں ایک ایک پتنگ۔ ہم نے بجلی کا بجن دے دیا تو کمرے کے دوسرے حصے میں روشنی ہوئی۔ وہاں بھی ایک بجن تھا۔ اس سے ادھر کا کمرہ روشن ہوا۔ غسل خانہ بھی تھا اور دروازے کے اندر ایک نوٹس بھی لٹکا تھا کہ اس کمرے میں تین آدمی رہیں تو ۷ فرانک دیں۔ دو رہیں تو ۵ فرانک اور ایک آدمی ہو تو نقطہ ۶۶ فرانک۔ ہم نے غنیمت جانا کہ ہم ایک ہی آدمی ہیں۔ ورنہ ۸ فرانک دینے پڑتے۔ ۸ فرانک کی تو سیدھی سیدھی یہ بچت ہو گئی۔

ہم نے ٹیلی فون اٹھایا۔ پاکستان سفارت خانہ۔ "ہاشم"

بولے۔ "ہاں آگئے۔ آجاؤ"

"کیسے آئیں؟"

بولے۔ "پیرس میں ٹیکسیوں کی کمی نہیں ہے"



derby-hôtel

5, avenue duquesne, 5

paris (75)



ہم نے کہا، ہم سے ٹیکسی دیکھیں کی بات مت کرو۔ ہم تو شہر کو پیدل چل کر دیکھنے کے عادی ہیں اور پھر پریس جیسا شہر! تمہارا گھر دور تو ہے لیکن پہنچ جائیں گے کوئی پون گھنٹے میں۔ اور اُن کھانا چاہتے کہیں کافی وغیرہ پر ٹانے کی کوشش کرو۔

بھٹکتے، نقشہ دیکھتے، سڑکوں کے نام پڑھتے۔ پانچ فونڈ کو تیرہ سے ضرب دے کر اُن کے فرانک بناتے جیسوں میں مختلف ملکوں کی پچی ریز گاری گنتے۔ ہاشم کے گھر پہنچ گئے۔ ہم نے جلتے ہی کہا۔
"آدم بو۔ آدم بو کھانا کہاں ہے"

بوسے یہاں نہیں ہے۔ ایک دیت نامی ریسٹوران میں کھدائیں گے تمہیں ایک دو دوست اور مہی ساتھ ہوں گے۔ کہو، سفر تو اچھا گزرا۔
ہم نے کہا، فضول باتیں ہم سے مت کرو۔

یہ دیت نامی رستوران بہت پُر اصرار ساتھ۔ نیم تاریک کمرے میں جا لے گئے ہوئے۔ فرش پر پھٹے کاغذوں اور کوڑے کے انبار۔ لکڑی اور تین کی جھولتی ہوئی کرسیاں، ایک چھوٹے نکلا ہوا صوفہ۔ دیواروں پر کچھ پوسٹر۔ کچھ پتہ نہ چلا کہ ہنوتی والے دیت نامی ہیں یا سائیکلوں والے۔ ہمارے ساتھ ایک صاحب فریج داں تھے۔ انھوں نے کونٹر پر جا کر طویل مذاکرات کئے اور اس کے بعد پیسے ادا کئے۔

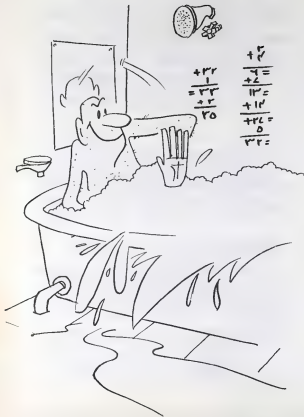
ہم نے کہا: یہ کیا ہے؟

بوسے: اس رستوران کا دستور ہے پیسے پہلے لیتے ہیں۔ کھانا بعد میں دیتے ہیں۔ لاتے ہیں سرورِ اول۔ دیتے ہیں شراب آخر۔

یہ رستوران بس اللہ کی رحمت کا عمدی ہوٹل تھا۔ مشکو عورتیں پتھر کی میزوں پر پوچی پھرتی اور کھانا پر دستی ہوئی۔ ہم چھ ساڑھے چھ آدمی (ہاشم کی بیگم اور ان کا بچہ تن تو تے بھی ساتھ تھا) ایک چھوٹی سی میز پر آپس میں گھٹنے بھڑکتے ہوئے بیٹھے۔ چاول آئے۔ پیالوں میں کچھ دھوون سا آیا۔ پھر چینی رستوران کا سا کھانا لال مرچوں کی چٹنی بھی۔

دھوون تو ہم نے نہ سکے چاولوں پر تھوڑا سا چکن کا ٹکڑا رکھا۔ مرچیں ڈالیں اور چمچے سے نوش کر گئے۔ ہاشم نے مہذب بننے کی کوشش میں پہلے اپنا کانا زمین پر گرایا پھر بیگم کا کانا مگنا اور گرایا۔ ان کچھ چاول ہم نے بھی گرائے۔

اتنے میں گیارہ بجے کا عمل ہو گیا۔ ہوٹل ڈربلی کے خیال سے وحشت ہو رہی تھی لہذا ہاشم سے ہم نے کہا آج ہمیں پیرس کی گلیوں میں گھماؤ۔



$$\begin{array}{r} + 11 \\ \hline 1 \\ \hline = 11 \\ + 1 \\ \hline 10 \end{array}$$

$$\begin{array}{r} + 1 \\ \hline 1 \\ \hline + 1 \\ \hline 11 \\ \hline + 11 \\ \hline + 11 \\ \hline 0 \\ \hline 11 \\ \hline \end{array}$$

جانے یہ رستوران کہاں واقع تھا اور ہم کن کن کوچوں سے ہو کر نکلے بعض
سڑکوں پر تو اس طرح چراغاں ہو رہا تھا۔ جیسے جہازے اس نودو لوتوں کی بیاہ
شاریوں میں ہوتا ہے۔ شاید کرمس کی ریہرسل تھی۔ یہ پرانی سبزی منڈی ہے جسے
اب ڈھایا جا رہا ہے۔ یہ پگال ہے۔ عریاں گلیوں کی قطار در قطار۔ یہ شائے تیز
روشینوں تلے دعوتِ نظارہ اور دعوتِ نہ ہانے کیا کیا! گاہک منڈلاتے ہوئے۔
ہم نے ہاشم سے کہا۔ خیر ہو چکی سیر۔ اب واپس!

”چھیاٹھ فرانک“

ہم نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی چیز ڈھنگ کی ہو تو بطور فرانس کی
یادگار کے اپنے سوٹ کیس میں رکھ کر لیتے چلیں۔ سوائے کپڑے ٹانگنے کے معمولی ہڈوں
کے کچھ بھی نہ تھا۔ نیند ہماری غائب ہو چکی تھی۔ ہم کا نقد پسلے کر بیٹھ گئے اور حجاب
بجڑنے لگے۔

ہمارا ارادہ تو پندرہ فرانک دالے ہوئے میں ٹھہرنے کا تھا لیکن ممکن ہے
اس میں کمزور نہ تھا۔ لہذا پچیس فرانک دیتے۔ گویا یہاں فقط ۴۱ فرانک نامزد سے
رہے ہیں۔ ہاشم کے گھر پیدل جا کر بچاتے کم از کم پانچ فرانک۔ کل ایئر پورٹ پر قلی
نہ لیں گے سامان خود اٹھائیں گے۔ مزید بچت تین فرانک۔ کل دو پہر فائدہ کریں گے
کہ معدے کے فعل کو درست دکھتا ہے۔ اس چلتے پل لیں گے۔ بچت چھ فرانک۔

بقیہ سفر میں اخبار نہیں خریدیں گے۔ — پانچ فرانک
بال نہیں کٹوائیں گے۔ — پانچ فرانک

کھر خط نہیں لکھیں گے۔ دو فرانک

یہ ہو گئے چھبیس فرانک ابھی میں پندرہ فرانک اور بچانے تھے۔

اچھا تو بیرون کو ٹپ بھی نہیں دیں گے۔ یہ مونچھوں والا دربان ہمیں یوں بھی پسند نہیں اور سوٹ کیس ہم خود اٹھا کر لائے تھے۔ مزید بچت تین فرانک۔

ان کا ایک تو ایر اٹھا کر اپنے سامان میں رکھ دیا۔ چار پانچ فرانک کا تو ہو گا ہی۔ لیکن اس پر تو ہوٹل ڈربی لکھا تھا۔ اور پھر ہمارے سوٹ کیس میں جگہ بھی نہ تھی۔ لہذا اس خیال کو رد کر دیا۔ بلب اتارنے کا خیال بھی نہ چھا۔ کیونکہ ان لوگوں نے

پیش بندی کر رکھی تھی۔ بہت اونچا لگا رکھا تھا اور ابھی میں بارہ فرانک بچانے تھے۔ ہم نے سوچا۔ اتنا اونچا ہوٹل ہے۔ ناشتے میں انڈا ضرور دیں گے جو پندرہ میں

فرانک دلے ہوٹل نہیں دیتے۔ آدھے فرانک کا انڈا ہوا۔ باقی ساڑھے گیارہ فرانک یاو آیا کہ لوور ہم نہیں جا پاتے۔ جلتے تو مکٹ لینا پڑتا ورنہ گائیڈ ہک یا کارڈ خریدتے تین ساڑھے تین فرانک اس میں لگانے چاہئیں۔

اب بس آٹھ فرانک کا حساب ہمیں اور جوڑنا تھا۔

کیوں نہ ان کا بلفٹ بار بار استعمال کر کے ان کی بجلی خرچ کریں۔ میٹرھیوں پر سے اترنے میں جو تے کی جو گھسائی ہوتی ہے وہ بھی بچے گی۔ دو فرانک اس مد میں بھی بچائیں۔

باقی رہے چھ۔

ایش ٹرے اٹھا کر تھیلے میں ڈال لی۔ ایک فرانک اس کے دام لگائے۔

باقی پانچ فرانک۔

غسل خانے میں سے صابن بھی اٹھا کر تھیلے میں رکھا۔ باقی چادر۔

اتنے میں یاد آیا کہ ایسٹرڈم اور لون وغیرہ میں ڈھائی ڈھائی فرانک منانے کے دیئے تھے۔ یہاں غسل خانہ موجود ہے۔ ایک اب نہایت۔ ایک کلی صبح اٹھ کر نہایتیں۔ یعنی پانچ فرانک یہ وصول کریں۔

گویا ایک فرانک کا فائدہ جیسے رہا۔ ہمارا چہرہ خوشی سے کھل گیا اور ہم کپڑوں سے باہر ہو کر ٹب میں بیٹھ گئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا توازن ادائیگی موافق ہونے کے باوجود ہمارے دل کا بخار ابھی تک پورا نہ دھلا تھا۔ لہذا ہم نے ٹب میں بیٹھ کر غسل گاتے ہوئے (ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آ سکے) خوب پھینٹے اڑاتے کہ خود ہی فرش صاف کرتے پھریں گے۔ گویا ایک آدھ فرانک کے تنے اور ان لوگوں کو دیا یا۔ ہم عموماً کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتے لیکن جو لوگ دوسروں کو روٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی ہونا چاہیے۔

پراگ (۱۳ نومبر تا ۱۴ نومبر) اور وارسا

(۱۵ نومبر تا ۲۰ نومبر) کا احوال سمجھا نہیں جاسکا

ویانا

۲۱۰۲۰ نومبر ۱۹۶۷



ویانا — (اوپر) رنگ اسٹراس میں آپرا (نیچے) مشہور بازار گریبن



ہم ویانا پہنچتے ہی ڈی ویلیو ہو گئے

مولوی محبوب عالم ویانا گئے تھے تو ہم کیوں نہ جاتے۔ یہ سچ ہے کہ آنکھوں والوں کے لئے ویانا میں بہت کچھ ہے۔ مثلاً آنکھوں کی پیچیدہ بیماریوں کے ہسپتال ہمارے بہت سے آئی اسپیشلسٹ ہیں سے بصیرت حاصل کر کے گئے ہیں۔ لیکن ہم جو اپنی سیدھی راہ چھوڑ کر ویانا گئے تو اس میں مولوی محبوب عالم سے ہمارے جذبہ مسابقت کو بہت دخل تھا۔ ویانا کسی طرح ہمارے پروگرام میں نہ آتا تھا اور سبھی ملکوں میں تو ہمارا کچھ نہ کچھ جھوٹا سچا منصوبہ ہی کام تھا۔ یہاں ہمیں از خود رہنا اور اپنی گروہ سے خرچ کرنا تھا۔ ہم نے ہوائی اڈے پر آ کر فرمائش کی کہ کوئی سستا سا بغیر غسل خانے کا ہوٹل بتا دو۔ ہم نے تو سرائے کہا تھا لیکن یہ لفظ وہاں کوئی نہ سمجھا۔ انھوں نے کہا، اچھا۔ کانگریس ہوٹل میں چلے جاؤ۔ ایک سو بیس شلنگ روزانہ دے دینا۔ ہم نے کہا۔ ہم پرانے مسلم لیگی ہیں۔ آج تک کانگریس سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ اب اس میں کیوں داخل ہوں۔ اس پر اور غیر کانگریسی ہوٹل انھوں نے بتائے لیکن وہ زیادہ منگے تھے۔ آخر ہم نے کہا، میاں آؤ اور پلو

وہیں چلو۔ شیرید عاتیرتا ہے وقت رفتن آب میں۔

ایک سو بیس شلنگ کچھ کم نہیں۔ ہم نے حساب لگایا تو بیلا اٹھے لیکن یہ جان کر قدرے سکون ہوا کہ یہ برطانوی شلنگ نہیں ہیں بلکہ ایک ڈالر میں پچیس والے ہیں۔ ایک روپے میں پانچ جانے۔ ڈالر والے کی کیا حقیقت ہے۔ ہم پیسے والے آدمی ہیں۔ ہماری جیب میں پانچ پانچ پونڈ کے نوٹ تھے۔ ایک نہیں دو تین۔ ہم نے ایک پھینکا کہ لاؤ شلنگ دے دو۔ ایک سو بیس والے نے اسی طرح اٹھا کر ہمیں دے دیا اور کہا۔ یہ نہیں چلے گا۔ کوئی اور سکتا ہے تو لاؤ۔

ہم نے کہا: کیوں کھوٹا ہے کیا؟

بوسے، کھوٹے کھرے کامیں نہیں جانتا لیکن فی الحال اس کا بھاد نہیں

نکلا۔

ہم نے کہا۔ بھاد ہم بتاتے ہیں ایک پاؤنڈ میں ۲۰ ۸۰ ڈالر ہوتے ہیں۔ احتیاطاً لکھ لو۔

بولا، جی نہیں۔ اب نہیں ہوتے۔ آپ نے اخبار نہیں پڑھا۔ آج سے پونڈ ڈی ویس ہو گیا۔

ہماری آنکھوں کے آگے سارے ناچنے لگے۔ ہمیں کبھی گمان نہ ہوا تھا کہ حکومت برطانیہ ہماری پشت میں یوں چھرا گھونپے گی۔ ہم سے صلاح کئے بغیر اسٹرلنگ کی قیمت گھٹا دے گی۔ یہ جو عرب ممالک کے اتنے سارے اسٹرلنگ برطانوی بینکوں میں ہیں ان کا کیا ہو گا۔ امیر کویت کو۔ شاہ سعودی عرب کو۔ سلطان ابو ظہبی کو اور خود ہمیں برطانیہ کے اس عمل سے جو نقصان پہنچا ہے اس

کی ذمہ داری کس پر ہے۔

ہم نے پورٹریٹ سے پوچھا : کیا یہ سامان کہاں لئے جا رہے ہو ہمارا۔ ہماری اقتصادی حالت خراب ہو گئی ہے۔ کوئی جہاز قاہرہ جانے والا ہو تو اس میں بے چارے کراچی جانے والا ہو تو اور اچھا ہے۔

بولنا : جی کراچی کا تو پتہ نہیں، قاہرہ اب پر رسول جائے گا جہاز جلدی کیجئے شہر کی بس بھجھوٹنے والی ہے۔ دس شلنگ غایت فرمائیے۔ ڈانکے مٹرن شکریہ !

اس قسم کی ہم پر چوٹ پڑے تو ہماری فینڈ تو بے شک حرام ہو جاتی ہے۔ اور کوئی خاص پروا ہم نہیں کرتے۔ چنانچہ ہوٹل میں فروکش ہوتے ہی ہم نے مووی مجسٹریٹ عالم کا سفر نامہ نکال لیا۔ اتنے میں میجر صاحب نے فون کیا کہ آپ ویانا کا شہینہ ٹور لیں گے؟ آٹھ بجے شروع ہوگا۔ فرمے کا ہے۔ بس جگہ جگہ گھمائے گی۔ ریسٹورانوں میں۔ باغوں میں رقص گاہوں میں اور آخر میں ایک عمارت کلب میں بھی لے جائے گی۔ وائن یعنی شراب کا بھی انتظام ہے۔

پورک یعنی سور کے گوشت کا بھی؟ ہم نے پوچھا

بولے : جی ہاں !

ہم نے کہا : یہ انتظام ہوٹل کی طرف سے ہے؟ یعنی ہمارے کرائے میں شامل ہے؟

میجر صاحب نے کہا : جی ملٹ آپ کو یہیں سے مل جائے گا۔ آپ کے بل میں ہم لگا دیں گے۔ دو سو شلنگ کا ہے۔

ہم نے کہا : ہمیں پریشان مت کرو۔ ہمیں نیند آرہی ہے اور پورک
 ہم نہیں کھاتے :
 یہ کہہ کر ہم پھر سفر نامے میں جُٹ گئے

معلوم ہوا کہ اسے اللہ کے بندے اگر تھے ویانا دیکھنا ہے تو مینہ بھردہ
 ہفتے دو ہفتے کو یہاں ٹھہر — میوزیم، لائبریریاں، محل، اوپرا، تھیٹر، باغ،
 کوچے بازار — آج بے شک آسٹریا کو لوگ سیاسی طوفان پریشان میں نہ لائیں
 لیکن ایک زمانے میں تو یہ غالباً یورپ کی سب سے بڑی سلطنت تھی۔ چیکو سلوواکیہ
 ہنگری، بحر منی وغیرہ سب زیرِ نگیں تھے۔ ویانا یورپ کا قلب تھا۔ آج سے تین
 چار صدی پہلے تو جب ترکوں کا اقبال آسمان پر چٹمک زنی کرتا تھا۔ انھوں نے
 ویانا کو بھی اپنی جاگیر میں شامل کرنے کی کوشش کی تھی۔ پہلی دفعہ سلطان سلیمان
 ثانی نے ۲۲ ستمبر تا ۱۵ اکتوبر ۱۵۲۵ء۔ اور دوسری بار فاروقی صدرِ عظم
 ترکی نے ۱۴ جولائی تا ۱۲ ستمبر ۱۶۸۳ء ویانا کا محاصرہ رکھا۔ لیکن آسٹریا کی مدد
 پر اہل پولینڈ آگئے۔ اہل سیسنی آگئے۔ اہل بوریہ آگئے اور اہل فرانس آگئے
 ان کی متحدہ قوت کے سامنے ترکوں کی ترکِ زاد کامیاب نہ ہو سکی۔ ورنہ ؟ ورنہ
 کا مولوی محبوب عالم نے بھی سوچا۔ ہم نے بھی سوچا۔ یہ جو سامنے جا بجا گرجوں
 کے ٹھیلے مینار نظر آتے ہیں۔ کیا عجب یہاں سلیمانہ اور نیخی جامع کی سی مسجدوں
 کے گنبد ہوتے۔

آج سے ستر سال پہلے کا ہندوستان دیکھتے جہاں سے مولوی محبوب عالم

آئے تھے۔ اور تتر سال پہلے کا دینا۔ بیان کرتے ہیں کہ ہونٹوں میں لفٹ تھے۔
 ٹرائیں کچھ دفانی تھیں۔ کچھ بجلی سے چلنے والی بھی جیسی آج کل ہیں۔ اخبار لاکھوں
 کی تعداد میں پھٹتے تھے۔ مولوی صاحب نے اخبار ”دینارک بلاٹ“ کا کارخانہ دیکھا
 معلوم ہوا کہ ایک لاکھ پرچہ ہر روز چھپتا ہے اور صبح و شام دو مرتبہ شائع ہوتا ہے۔
 اس کارخانہ میں ایک ہزار آدمی ملازم ہیں۔ تمام کام کلوں سے ہوتا ہے۔ سکتے کے
 حدود بھی لینوٹا پ کلوں کے ذریعے جوڑے جلتے ہیں۔ کئی مشینیں چھاپنے
 کی موجود ہیں۔ بیلن سب سے بڑی مشین ایک گھنٹے میں ۲۲ صفحے کے ۲۲ ہزار
 اخبار چھاپ کر کاٹ کر اور موڑ کر رکھ دیتی ہے بلکہ شمار کرنے والی مشین بھی ساتھ
 لگی ہے جو خود بخود بتلاتی جاتی ہے کہ کتنا اخبار چھپ چکا۔ یہ کارخانہ برقی طاقت
 سے چلتا ہے۔ مولوی صاحب نے دینارک کے عجائب گھر دیکھے۔ تھیسٹر دیکھے پارلیمنٹ
 ہاؤس دیکھا۔ پلاٹر کے عجائبات دیکھے کہ ایک وسیع پارک ہے جس میں تفریح کی
 بے شمار چیزیں ہیں اور جس میں ہمیشہ میل لگا رہتا ہے۔ دینارک کی خوش دل عورتوں نے
 ان سے چٹائیں بھی لیں۔ مولوی صاحب نے چونکہ صرف گفتنی درج گزٹ کیا ہے۔
 لہذا ان کے رد عمل کا ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لکھتے ہیں: ”پارک میں سڑک ہے
 دونوں طرف درخت ہیں۔ درختوں کی تمام شاخوں پر سرخ سبز اور سفید روشنی
 کے برقی میپ لگے ہیں۔ ایک ہنر دانے سے سب میپ روشن ہو جاتے ہیں اور
 بالکل طلسمات کا باغ معلوم ہونے لگتا ہے۔ مختلف رنگوں کے باریک کاغذوں کے
 گول گول ٹکڑوں کی لوگ ٹھیکیاں بھر بھر کر ایک دوسرے پر پھینکتے ہیں۔ عموماً مرد
 خوب صورت عورتوں پر اور عورتیں مردوں پر۔ پہلے واقفیت اور آشنائی کی کوئی

شرط نہیں۔ جس پر تمہارا جی چاہے پھینکو۔ کوئی داؤ فریاد نہیں بلکہ سب لوگ خوش ہوتے ہیں۔ زمین پر دوانگل موٹا فرش ان کاغذی پھولوں کا ہوجاتا ہے۔ ایک دو عورتوں نے بھر پر بھی چھینکے۔ جب میں نے جواب نہ دیا تو ایک کم بخت نے پشت کی طرف سے میرے کالر کو اٹھا کر ایک مٹھی اس میں پھینک دی جو میں نے مکان پر جا کر نکالی۔ معلوم ہوا۔ اس ذریعہ سے بعض عورتیں مردوں سے آشنائی پیدا کرتی ہیں۔ یہ ایک پرستان کا نظارہ تھا۔ سچ یہ ہے کہ انسان ان کے آسیب سے مشکل سے بچ سکتا تھا۔ باروت و ماروت کی آزمائش کا قصہ اگر صحیح ہے تو وہ معذور تھے۔“

لیکن میاں انشا کو تو بس دو روز یہاں ٹھہرنا تھا۔ اور ان کے پونڈ ڈی ویلیو ہو گئے تھے اور یہ موسم سردیوں کا تھا۔ اور یہ جینائیں مہ جینائیں جلنے لگاں تھیں اچھا تو کل پرا ترکی سیر بھی کریں گے۔

آج ہم نے جی کڑا کر کے شہر کا ٹورے ہی لیا۔ سٹر شنگ پیسہ تو ہاتھ کی میل ہے۔ ہم نے تو آج ملک اس کی کبھی پروانہ کی۔

میں اپرا ہاؤس سے چلی۔ گائیڈ نے کتنا باچنی شروع کی یہ رنگ بے یعنی یہاں کی سرگھر روڈ۔ ادھر باغ عامہ ہے۔ یہ ادھر آرٹ کا عجائب گھر ہے جو تین پیر ہونے کے باعث بند ہے اور یہ سامنے تاریخ کا عجائب گھر ہے (اس میں بھی نہیں ملے کر گیا) اور یہ بچوں کی عجیب و غریب تھریا کا مجسمہ ہے۔ اور اب صاحبزادہ دیکھو پارلیمنٹ کا ایوان۔ اچھا تو اب ہم قصر حکومت کے سامنے آ گئے۔



ملکہ عالیہ میریا تجریا

اس میں پریسڈنٹ رہتا ہے۔ صدر ڈولفس بھی ۱۹۳۶ء میں اس عمارت میں قتل ہوا تھا۔ یہ قیصر گرفت KAISERGRUFT ہے۔ اس کے اندر چلتے ہیں کیونکہ اس میں بادشاہوں کے تابوت رکھے ہیں۔ یہ فرز جوزف کا تابوت ہے یہ ملکہ ماریا تھریسیا کا۔ یہ فلاں بادشاہ کا۔ یہ فلاں ولی عہد کا۔ اور اب چلو باہر یہ پرانا گر جا بھی دیکھو یہ مشہور سرک ہے۔ میرا ہنر سڑ اس شاپنگ کے لئے بہترین جگہ (ہم نے فوراً نام نوٹ کر لیا کہ کوئی یہاں آئے گا تو اسے لکھوا دیں گے۔ یہاں خریداری کرے) اور اب صاحبو یہ سامنے مشہور برن پلس ہے۔ شان آسٹریا کا محل جس کی تعمیر میں ۵۵ برس لگے۔ اس میں چودہ سو کمرے ہیں اور ایک سو چالیس باورچی خانے ہیں۔ ہمیں اس وقت بھوک لگ رہی تھی۔ ہم نے پوچھا۔ اتنے سارے باورچی خانوں میں کیا کیا پکاتا تھا۔ لیکن وہ گائیڈ ہمیں تفصیلات نہ بتا سکا۔ آئیں بائیں شاہیں کر کے رہ گیا۔ یہ محل درساوی کی نقل تھا۔ گائیڈ نے جو یہ حوالہ دیا تو اک تیر میرے سینے میں مارا کہ اٹے اٹے۔ ہمیں فوراً اپنے چھیاٹھ فرانک پرس دلے یاد آ گئے۔ اب اس کے کمروں کی سیر شروع ہوئی۔ یہ خواب گاہ۔ یہ بیٹھک۔ یہ دربار گاہ۔ یہ رقص کا ہال سب ایک سے ایک بڑھ کر۔ سب میں تصویریں۔ یہ ملکہ تھریسیا ہیں۔ یہ ان کے باپ کی تصویر ہے یہ ان کا بیٹا ہے۔ یہ ان کی بیٹیوں کی تصویریں ہیں۔ ہم نے کہا، ماشاء اللہ کتنی اولاد تھی ملکہ عالیہ کی معلوم ہوا سولہ۔ گیارہ ان میں لڑکیاں تھیں اور پانچ لڑکے۔ ایک اور عورت کی تصویر لگی تھی۔ ہم نے کہا یہ کون ہے۔ بولیں یہ ان کی بیٹی ہے۔ اس کی اٹھارہ اولادیں تھیں۔ ہم نے کہا ماشاء اللہ — فیملی پلاننگ کا حکم نہیں تھا۔ ان دنوں کیا ہے؟

میں شاید ابھی تک اس کا رواج نہیں کیونکہ گائیڈ نے پوچھا۔ فیملی چائنگ کیا ہوتی ہے؟ ویسے ملکہ عالیہ کے یہ اولاد خوب کام آئی۔ سب کی شادیاں زبردستی کر کے یورپ کے تاجداروں سے کیں۔ فرانس کا بادشاہ، اسپین کا بادشاہ، اٹلی کا بادشاہ، یہاں کا بادشاہ، وہاں کا بادشاہ۔ سب کو فرزند ہی میں سے کر بغیر تلواریں چھلتے اور خون بہاتے سارے یورپ کی ملکہ بن گئیں۔ گویا ہمارے کروڑ پتی کا خزانہ ہمارے جو دوسرے کا رخاؤ واروں کو اپنی بیٹیاں بیہاتے ہیں۔ یہ نسخہ کوئی نیا نہیں، انھوں نے ملکہ ماریا تھریسیا سے لیا ہے۔

ایک سڑک پر سے گزرتے ہوئے گائیڈ نے کہا تھا۔ یہ موتسارٹ MOZART کا جسم ہے اور اب ٹون برس پچیس ہیں بھی کئی تصویریں انھوں نے بتائیں کہ یہ موتسارٹ ہے پانچ برس کی عمر میں۔ یہ پندرہ برس کی عمر میں۔ آخر ہم نے کہا کون تھا موتسارٹ یہ بھی تو بتاؤ۔

تب پتہ چلا کہ بیتھوون کی طرح کا کوئی گویا تھا۔ یورپ میں ہم نے جابجا موتسارٹ بیتھوون، باخ، شوہرٹ وغیرہ کے مجسمے اور ان کے نام کی سڑکیں دیکھیں جس سے قیاس ہوتا ہے کہ ہر چند اس وقت ریڈیو پاکستان کی شاخیں یورپ میں نہ تھیں۔ نہ فلم کمپنیاں تھیں لیکن گانے بجانے والے بھوکے نہیں مرتے تھے۔ کلاؤنوں کی خامی سرد تھی۔

اور پھر اس گائیڈ کے بچے نے ٹون برس پچیس سے لونا کر گاڑی پھر اور پرانے سامنے لا کھڑی کی اور کہا جان یہ ٹور ختم۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ امید ہے کہ دیا نا

میں آپ کا قیام خوشگوار گزرے گا۔

یہ کہہ کر وہ ٹپ پینے کے لئے بس لا دروازہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

ہم نے کہا: میاں پر اتر تو تم نے دکھایا ہی نہیں۔ وہ لافذی پھولوں کی سٹیاں

پھینکنے والی پری جمال عورتیں کہاں ہیں تمہارے خیال میں میں کچھ پتہ ہی نہیں؟

بوللا، پر اتر کا ٹور پلا ۲ بجے شروع ہو گا۔ اس میں دریائے ڈینیوب بھی دکھائیں

گے۔ اس کا ٹکٹ بھی ستر ٹنلک ہے۔ دوں آپ کو؟

پر دیس کا معاملہ تھا اور کوئی تعانیدار یہاں ہمارا جاننے والا نہیں تھا۔

نہ ہوا کراچی۔

قاہرہ

۲۲ نومبر تا ۲۸ نومبر ۱۹۷۷



دھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار

مطعم مستنصر خندق ابو صفین، شارع سلامہ، سالون عصفی، حلوانی الاصل

میدان التحریر :-

ہم نے ٹھنک کر اپنے کو غور سے دیکھا اور پوچھا، یا شیخ تیرا نام عبدالغفر بنی خالد

تو نہیں ہے ؟

جواب ملا " نہیں "

" ضیاء الحسن موسوی "

اس کا جواب بھی نفی میں ملا تو ہم نے نہایت تاسف سے کہا تو بھیجے۔

والوں نے غلط آدمی بھیج دیا یہاں۔ اسے شخص تو کیلینے آیا ہے قاہرہ ؟

قصہ غلط آدمی کا لاویان رطب اللسان یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک میاں

دہقان کو قریب شام ایک اجنبی مسافر رستے میں مل گیا۔ اسے وہ اپنے ساتھ لے

آئے۔ کھلا پلا کر اپنے ہی کمرے میں راگرو دہقانی کے مکان میں ایک سے زیادہ

کمرے ہوتے ہیں تو) سٹلایا۔ دہقانی میاں کو الگی صبح تڑکے ہی ایک کام سے دوسرے

گمان میں جانا تھا۔ لہذا انھوں نے اپنی ماں سے کہا : 'ماں ماں ! کل صبح مجھے بڑے تڑکے اٹھا دیجیو۔ اور اس مہمان کو صبح اچھا ناشتہ دینے کے بعد رخصت کیجیو'۔
 ماں نے کہا : 'اچھا بیٹیا'۔

ماں نے تڑکے ہی اٹک لگا دی۔ وہ مقامی میاں نے جلنے کی وحشت میں اپنی بجائے مسافر کا پا جام پہن لیا۔ (اگر وہ مقامی پا جامے پہنا کرتے ہیں تو) گھر سے دو کوس دور گئے ہوں گے کہ اُجالا ہوا اور ان کی نظریک سخت اپنی ٹانگوں پر پڑی۔ وہاں اجنبی کا دھاری دار پا جامہ نظر آیا۔ تو بول اُٹھے۔

'میری ماں بھی کتنی بے وقوف ہے۔ اٹھانا تھا مجھے۔ اٹھا کے بھیج دیا مسافر کو'۔

اس روز صبح ہم ڈینیوب کے ساحل پر گھومتے پائے گئے اور شام میں نیل کے کنارے ہوئی۔

دیانا میں آخری دن یورپ میں ہمارا آخری دن تھا اور کوٹاکے کی سرودی کا بھی۔ صبح اُٹھے تو باوجود اپنے اور کوٹاکے کے دم تحریر نہ تھی کا جھول معلوم ہوتا ہے، شہر گرہ گئے اور دستا نے لینے بھاگے۔ کنڈپ کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔ سڑک اور گھاس سب سفید ہو رہی تھی، برف تھلی یا پالا، کہہ نہیں سکتے۔ ہمارے پاس اب صرف اُدھان تھا۔ اس میں نوکر کنڈے میوزیم بھی دیکھنا تھا اور پراثر کی تفریح گاہ بھی۔ پھر نیلے ڈینیوب کی زیارت بھی کرنی تھی۔ میوزیم کوئی دس بجے کھلتا تھا۔ لہذا ہم نے اوپرا کے سامنے سے K ٹرام پکڑی اور پراثر کی طرف سدھارے۔ صبح اور سرودی کی صبح۔ وہاں اس وقت کیا دھرا تھا۔ پراثر کے سارے

مرنے تو مولوی محبوب عالم لوٹ کے لے گئے تھے۔ ہاں نیلے ڈمب سے ہم نے دعا سلام کرنی اور چلے سوئے فوراً کندے میوزیم دیس دیس کے رہن سہن کے عجائب گھر مولوی محبوب عالم لکھتے ہیں :-

”اس میں ہندوستان کی دیہاتی زندگی کا نقشہ چند کاشت کاروں کے بُت بنا کر دکھایا گیا ہے۔ یہ بنگال کے مزارع تھے۔ سیاہ فام اور بالکل برہمن تھے۔ ان کے پاس چھپر کا ایک جھونپڑا تھا۔ اگر ان کو دیکھ کر یہاں کے لوگ سب ہندوستانیوں کو ایسا ہی سمجھیں تو ان کا کچھ تصور نہیں۔ چنانچہ جب میں عجائب گاہ سے نکلا تو درجن نے میرے گائیڈ سے پوچھا کہ ان کپڑوں کو جو میں اس وقت پہنے ہوئے تھا۔ وطن میں جاکر کیا کروں گا؟ وہ سمجھتا تھا کہ ہندوستان جا کر میں سب کپڑے تار کر پھینک دوں گا اور جب میں نے اپنی فوٹ بک میں کچھ اندراج کیا تو اسے یہ معلوم کر کے بہت تعجب ہوا کہ ہندوستانی لکھنا پڑھنا بھی جانتے ہیں۔“

لیکن ہم جہد تنہا اس عجائب گھر کے دروازے پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ آج بند رہے گا۔ ہم نے ایک اہلکار سے کہا اے عالم۔ ہم تو ویانا آتے ہی اس میوزیم کے لئے ہیں کھول دے! لیکن بے کار۔ اس نے کہا۔ یہ تو بند ہے اور یہ سامنے والا ہٹری میوزیم بھی آج بروز منگل بند رہے گا۔ آپ کچھ گیلری دیکھ لیجئے۔ ہر چند کہ یورپ میں مسوری کے شاہکار دیکھ دیکھ کر ہمارا سینہ آرٹ کے رموز سے بے طرح ملو ہو چکا تھا تاہم مجبوراً وہاں گئے اور جب گئے تو تصویریں بھی دیکھیں اور کچھ کو پسند بھی کیا۔ خاص طور پر سولہویں صدی کے مشہور مصور بروگل کی تصویروں کو۔ جیسا میں ہمیں ہر ڈراپنگ آئے تھے۔ نو سرن میں پنورا ما کا کینوس دیکھ کر ہم مبسوت رہ گئے اور یہاں بروگل

نے کہ جزئیات کا بادشاہ ہے۔ ایک چوک کا نقشہ کھینچ رکھا تھا جس میں ہانک لگا کر پھل اور روٹی بیچنے والے، اپارچ، بیک منگے، بے فکرے سبھی کو اس خبری سے سمویا ہے کہ بس.....

کاغذی ہے پرین ہر سیکر تصویر کا
لیکن یہ ہم کیا تفصیل سے کر بیٹھ گئے۔ آپ کو اس سے کیا دلچسپی، یہ موضوع تو ہم ایسے فنونِ لطیفہ کے مبصروں کا ہے۔

وینا سے استنبول اور استنبول میں آدھ گھنٹہ ٹیلی لے کر قاہرہ۔ ساٹھ منیٹ
نشستوں کے لئے ایل ایم جہاز میں بم کل پانچ آدمی تھے۔ قاہرہ کے ہوائی اڈے پر
شام کے پونے نو بجے اترے تو وہاں قلی تو بے شمار تھے۔ کسی مسافر کا نام و نشان تک
نہ تھا۔ کسٹم والوں نے اور پاسپورٹ والوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ پوچھ گچھ کیا معنی اُن
کا بس جتنا تو ہمارے گلے میں مار ڈالتے۔ بینک کے ایس پیجنگ کونٹر پر ہم نے بے نیازی
سے پانچ پونڈ کا نوٹ پیسٹا اور کافی الحال ایک پونڈ کے مصری سکے دے دو۔ خزانچی
بوللا۔ جناب میرے پاس واپس کرنے کو چار پونڈ کہاں ہیں؟ آخر ہم نے جوتے کی خوب سی
جیب تلاشی لے کر دو ڈالر برآمد کئے۔ ایک اور پاکستانی مسافر سید آفتاب احمد کینڈا
سے آتے ہوئے دو دن کو یہاں اترے تھے۔ انھوں نے ایک ڈالر بمبیا یا باقی مسافر
شاید معری تھے۔

یا تو یورپ میں یہ عالم تھا کہ ہم اپنے سامان کے چاروں ٹنگ خود اٹھا کر بس تک لائے
تھے۔ کیونکہ ہونٹل کانگریس میں دس فیصد سروس چارج تو ضرور لے جاتے تھے لیکن ڈراہن

یا جمال قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔ یا یہاں دیکھا کہ پانچ آدمی صرف ہمارے سامان کے لئے
پکے۔ ایک سوٹ کیس ایک نے اٹھایا۔ دوسرا دوسرے نے۔ تیسرے نے ہمارے شیو
کے سامان کا تھیلہ اٹھایا۔ چوتھے نے ہمارے ہاتھ سے ہمارا بریف کیس چھین لیا۔ اب ہمارے
پاس فقط لندن ٹائمر کا اس روز کا پرچہ رہ گیا تھا، سوئسے پانچویں آدمی نے لے لیا۔ اور
سلام کیا کہ ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں۔ اور پھر ان بھلے انسانوں نے آدھے راستے
میں یعنی جاری کار سے کوئی دس گز کے فاصلے پر ان چیزوں کو رکھ دیا۔ وہاں سے دوسرے
آدمیوں کی ڈیوٹی شروع ہو جاتی تھی، وہاں ہم نے صرف تین آدمیوں کی خدمات حاصل کیں
چوتھے کو کوئی سامان نہ ملا۔ تو اس نے دھڑکے ہماری کار کا دروازہ کھولا اور تیسری کال ٹی۔
ہمارے ہی کو قاہرہ پہنچ کر عجب حمایت سی محسوس ہوئی جیسے اپنے گھر آگئے ہوں۔ تھوڑی
دُور گئے ہوں گے کہ ایک بستی سے اذان کی آواز آئی جس سے ہماری آنکھوں میں آنسو سے
آگئے۔ یہ کار یونیٹ کے دفتر نے ہمارے لئے بھیجی تھی لیکن ہمارے ہم سفر پاکستانی کو جس دست
کے اس ٹھہرنا تھا وہ انہیں لینے نہ آئے تھے لہذا ہم نے کہا بیٹھے پہلے آپ کو شریف پاشا
الکیر میں پہنچا دوں۔ ہمیں ہوٹل پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ یہ بہت اچھا ہوا کیونکہ ہم
ان کو چوبدار کو ڈرکھ لیتے تو اصل قاہرہ سے دُور رہتے۔ ٹخنوں تک پہنچتے ہوئے لہجے
چومنے۔ سر پہنچے۔ کھڑکڑائی بسیں اور ٹرائیں جما چکی، کیا بھی، حلوائی، نانائی، رکھے، سب سے ولے
شور بہ فردش۔ ٹھیوں کے کونے کے چائے خانوں میں گپ مارتے سماش کھیتے۔ فردیں
پینتے ہوئے لوگ۔ ٹریفک سٹنل کی لال روشنیوں کو دھتتا بتاتے ہوئے ایک بڑھیا بازار
میں اپنا گدھا لئے کھڑی تھی اس پر سترے لہے سے تھے۔ بچے ننگے پاؤں ننگے مردھا دیار
ہائیں پہنے آنکھ پھول کھیتے ہوئے.....

تو گویا یہ تھا تاہرہ۔ ہوٹل گارڈن سٹی میں کمرہ نمبر ۲۲ کا دیرچہ ہم نے کھولا تو عین سامنے دریائے نیل لہراتا نظر آیا۔ جہاز دیرچہ عین قصر انیل یعنی دریائے نیل کے بڑے پل پر کھتا ہے۔ ہم نے اوور کوٹ اتارا اور اسے تمہ کر کے سوٹ کیس میں سامے کپڑوں کے نیچے رکھ دیا۔ تو نے انگلستان سے آسٹریا تک ہماری خدمت کی ہے۔ اب آرام کرو ہم بھی تو تجھے اپنے کاندھے پر اٹھائے پھرے ہیں، جان سے لگائے رہے ہیں جیب میں اتھو ڈالا تو معلوم ہوا کہ جو رقم ہوائی اڈے پر بھنائی تھی۔ قریب قریب ماری فروزی اور بخشیش میں ٹھکانے لگ چلی۔ نیچے ہوٹل کے کونٹر پر جس عظیم شحم ہیرے یا دربان نے ہمیں اہلا وسلا کہا تھا وہ بھی کم از کم پانچ پیاسٹر کا حق دار تھا۔ لیکن جب ہم نے پچیس پیاسٹر کا نوٹ اسے دیا کہ اس کی ریز گاری میں دو تو اس کے پاس سے مشکل آٹھ نو پیاسٹر نکلیے۔ باقی کے عوض اس نے ایک زمانے کا سلام اور تھینک یو محاسے حوالے کئے۔ لیکن اب ہم مشرق میں تھے اپنے گھر میں تھے، شراب پینے اور سونہ کھانے والے کافروں سے دور۔ جہاز ابی بہت ہلکا اور کشادہ ہو رہا تھا، بالکنی میں نخل کر بیت کی کرسی پر بیٹھے اور ایک لبا سانس لیا۔ اتنے میں ایک دستک دروازے پر ہوئی یہ کوئی دوسرا سوچ نہ پوش بیرا تھا۔ بولا جناب بیڑ لاؤں۔ ہم نے کہا۔ نہیں بابا معاف کرو۔ بولا دھکی بھی ہے۔

ہم نے کہا۔ ہشت، اور وہ اپنی جہاز لہراتا ہوا بھاگا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے ایک کاغذ چپکا ہوا دیکھا جس پر ہوٹل کے ریٹ لکھے تھے :-

نامشتہ	۱۵۔ پیاسٹر	پنچ	۳۵ پیاسٹر
سینڈوچ پنیر کے	۵۔ پیاسٹر	سینڈوچ سور کے	۸ پیاسٹر

ہم شگ اٹھانے کو تھے کہ سر یاد آیا۔ کیا مجب ہمارے ملک کے ان ہونٹوں میں بھی جو لڑائیوں کے لئے ہوتے ہیں اس قسم کا التزام ہو۔

ہمارا قاعدہ ہے کہ کسی بھی وقت پہنچیں۔ ایک چکر ہٹل کے گرد فوج کا خور کر تے ہیں اور چونکہ انسان ہیں پھوپائے نہیں ہیں، راستہ بھولتے بھی ضرور ہیں اور کبھی کبھی تو ایسا کہ ٹیکسی والا بھی مشکل سے تلاش کر پاتا ہے اور عین اس روز ہمارے ہٹل کے آس پاس کے گلی کو پے والوں کا حافطہ ایسا خراب ہو جاتا ہے کہ وہ ہٹل اور سڑک کا نام سن کر منڈیا ہلا دیتے ہیں اور کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں ہم آٹا نہیں دات کے دس ساٹھے دس بجے تھے لیکن ہم نکلے۔ آگے ایک بڑا چوک تھا۔

نام اس کا میدان تحریر۔ جی خوش ہوا کہ اس ملک میں لکھنے والوں کی اتنی قدر ہے اس کے مقابلے میں کراچی کو دیکھئے کہ ہمارے نام پر ایک بھی سڑک یا چوک نہیں بلکہ گلی کے سرے پر ہم نے جو این انٹا اسٹریٹ کی تختی اپنے خرچ سے لگائی تھی وہ بھی کارپوریشن والے اتار کر لے گئے۔ ہم یہ انھوں سے کہہ کر رہے تھے کہ ایک آٹا صورت نظر پڑی۔ پروفیسر محمد حسن الاعظمی جادہ ہے تھے۔ ہم نے کہا حضرت آپ کہاں؟ برٹے خصوص سے سلام دُعا ہوئی اور باتوں باتوں میں انھوں نے بتایا کہ یہاں اہل علم کی قدر تو ہے لیکن میدان تحریر کا مطلب ہے بریش سکور۔ تحریر کا لفظ حریت کا رشتہ دار ہے۔ ہم نے کہا پھر محرر۔ چنگی محرر وغیرہ کا بھی یہی مطلب ہوا کہ اپنے عمل میں آزاد ہیں جس سے جو چاہیں وصول کریں۔ فرمایا۔ وہ بات اپنے ناں کی ہے۔ وہ تو یہ وضاحت کر کے چلتے بنے لیکن ہم چوک کی روشتیوں میں آنکھیں جھپکتے رہ گئے۔ اس چوک سے

کوئی چوہہ پندرہ رستے پھٹتے ہیں اور جس اونچی بلڈنگ کو ہم نے نشانی مقرر کیا تھا ویسی جہیں دس بلڈنگیں نظر آئیں۔

ہم نے اپنی سڑک کا نام تک یا ونہ کیا تھا کہ دُور تھوڑا ہی جا رہے ہیں۔ ہٹلر کا نام بتا کر پوچھا تو سب نے کہا۔ یہ نام تو ہم نے آج ہی سنا ہے۔ کہاں ہے، کس طرف کو ہے؟ کدھر ہے؟ آخر ہم نے کہا لوگو۔ جہیں دریائے نیل پر پہنچا دو۔ آگے ہم جانیں ہمارا کام۔ نیل پر پہنچے۔ وٹاں سے نیل کے پل پر پہنچے۔ مشکل یہ ہے کہ ہماری کھڑکی سے تو نیل نظر آتا تھا لیکن نیل سے ہماری کھڑکی نظر نہ آتی تھی۔ آخر ایک ٹیکسی ڈرائیور نے ہماری مشکل حل کی اور دروازہ کھول کر کہا۔ اندر بیٹھئے۔ ہم بیٹھے لیکن ٹیکسی دس دس قدم جا کر یک لخت رُک گئی۔ ہم نے کہا یا اتھی! پٹرول ڈلو کر چلا کرو۔ یوں مسافروں کو راستے میں نہیں رکھا کرتے۔ بولا بھی پٹرول تو بہت ہے لیکن آپ کا ہونک آگیا ہے۔

ہم نے کہا۔ یہ بات تھی تو تم انجلی کے اشارے سے بتا دیتے۔ بولا بھی انجلی سے اشارہ کرتا یہاں بد تمیزی سمجھا جاتا ہے اور پھر ٹیکسیاں کاہے کے لئے ہیں؟ آپ لوگوں کی خدمت کے لئے ہی تو ہیں۔ سات پیاسٹر؟

اہرام کے سایے میں

ہر شام جب ہم اپنی بالکنی میں سے نیل کے اس پار اور اُس پار قاہرہ کی روشنیوں کا سیلاب دیکھتے ہیں تو یادوں کے خلیات میں سے کچھ چہرے ابھرنے لگتے ہیں۔ ان روشنیوں میں شاید وہ چراغ بھی شامل ہیں جن کے بغیر پاکستان کے بے شمار گھروں میں درد کا اندھیرا ہے۔ جمید ہاشمی کا شریہ چہرہ۔ خاقان قریشی کی مہربان مسکراہٹ۔ ابو صالح اصلاحي پان لکھتے بیٹھے کہتے۔ جعفر منصور۔ چلبلاہٹ کا بتا دیا۔ ایم۔ بی خالد زندگی کے عزائم سے بھر پور اور خالد ضیا لودھی جس کے گھر سے ہمارے گھر کی دیوار ٹکی تھی۔۔۔۔۔ یہ سب لوگ اپنی آئی اے کے حیارے سے چلتے تھے لیکن پنچے نہیں۔۔۔۔۔ اے دوستو!۔۔۔۔۔ اے دوستو!

اور ابو المول کی زبانی ہم نے آج شام کے جھٹ پٹے میں یہ بنکار سنی کہ میں لازوال ہوں۔ دنیا موت سے ڈرتی ہے اور موت مجھ سے ڈرتی ہے۔ میں اور خوف کا یہ ہریم اعظم رہتی دنیا ملک کھڑے رہیں گے۔ ابو المول کو نہ اپنی ناک نظر آتی ہے نہ ہریم اعظم کا اکھڑا



ہوا پستر نہ خوف کے تابوت کا خالی ظرف۔ ننگ و خشت اگر قائم بھی ہیں تو ننگ و
 خشت میں دھرا جی کیا ہے جو موت اور حیات کو جد کرے۔ کبھی غزاں نے پلائنگ کے پھولوں
 کو بھی تاکا ہے۔ اُسے تو تازہ اور شاداب گل پسند آتے ہیں۔ پتھر باقی ہیں اور ریت باقی
 ہے لیکن توت عنخ آمون — ملکہ نفرتیتی — حسن کے تاجدار کہاں ہیں۔ عیش کے
 جانشین کہاں ہیں۔ جہاں بیٹھے ہم ابوالہول کی جگہ رسیں دہکتے تھے۔ مین ویاں کھڑے
 ہو کر انسانی اور کھوپڑا نے اہرام اور ابوالہول کو دیکھا ہوگا۔ یہیں سے ہیرودوش
 نے ان پر نظر ڈالی ہوگی۔ یہیں سکندر اعظم کے دندانہ قدم پڑے ہوں گے قبض
 کا مشرب لیا اور اجڑا — اور کل میاں پولین بونا پارٹ کھڑا تھا — یہ ریت اور ریت
 پر بگڑتے ہوئے مٹتے ہوئے قدموں کے نشان ناموروں کے — ہم ایسے
 بے ناموں کے —

شب کے اندھیرے میں اپنے آس پاس کی فضا کو ہم نے سرواڑہوں سے بوجھل پایا۔ بس سکیاں بھرتے سنا اور ابوالہول برابر بنکار رہا تھا..... میں لازوال ہوں میں لازوال ہوں..... یکایک سامنے دیوار پر ایک سایہ نووار ہوا۔ غور سے دیکھا تو ایک کتے کو پایا جو کھنڈروں میں جانے کہاں سے نکل آیا تھا۔ اس نے ٹانگ اٹھائی، ابوالہول کے منہ کی ابدیت پر چٹاب کیا اور ایک طرف کو نکل گیا۔ اپنی سال دو سال کی زندگی سے لطف اندوز ہونے کے لئے۔

روشنی اور آواز کا یہ پروگرام قریب قریب ہر شام کو ابوالہول کے مجھے کے سامنے ہوتا ہے۔ چھپی ہوئی روشنیاں ایک ایک کمرے کے اہرام اور ابوالہول کے پہلوؤں کو اجاڑتی ہیں اور پس منظر سے کمٹری ہوتی ہے۔ ایک آواز — پھر دوسری آواز۔ پتھر گھسیٹ کر لانے والے خزاؤں بے نام بے گامری مزدوروں کا شور سناؤ دیتا ہے۔ سامنے مصری دیوتاؤں کے مندروں میں آدنی اترتی ہے۔ نئے فرعون کی تاج پوشی کا جشن ہوتا ہے۔ بلے بلے بچتے ہیں اور اس کے بعد اس کی میت اٹھتی ہے اور ماتمی نغمہ فضا میں پھیل جاتا ہے۔ ملکہ نفرتیتی کا نفرتی قصہ گونجتا ہے۔ کاہن کی بیماری بھر کم آواز سناؤ دیتی ہے۔ حدیباں جاگتی ہیں اور ہماری گھڑیوں کے دقیقوں اور ساعتوں کی طرح گزر جاتی ہیں۔ تادیخ کے پردے اٹھتے ہیں، اگرتے ہیں، شہرستے ہیں۔ اجڑتے ہیں۔ دریائے نیل بھر رہا ہے، ٹمٹما ہے، گونپلیں پھوٹتی ہیں اور فصلیں کھٹی ہیں باپ اپنا ہم بناتا ہے۔ بیٹا دوسرا ہم بناتا ہے اور پھر غضب ناک هجوم ان کے تابوت کھول کر ان کی لاشوں اور میموں کو گھسیٹ لے جلتے ہیں۔ ہم نے مصری عبد عقیق کے

عجائب گھر بہت دیکھے، ہر جگہ دیکھے۔ لندن میں، جنیوا میں، لائیڈن میں، ویانا میں، ایمرٹرم میں، لیکن قاہرہ کے عجائب گھر کے سامنے گرویں۔ یہاں جا کر ان شان رفته کی عظمت و جبروت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ فرعون خالصہ با سامانی لوگ تھے۔ پھر ان کے معمار، مہندس، ستارہ شناس، نقش گز منشی، خوشنویس۔

زمر نے سیلاب نے نیچے کی مٹی اور کروی اور اوپر کی مٹی نیچے۔ اس سرزمین پر پھر لوہا نیوں نے قبضہ کیا۔ وہ من اسے آکر روند گئے۔ جٹانیوں کے گھاٹوں نے حکومت کی۔ انگریز چھاتی ڈالے بیٹھے رہے۔ اور آج اسے اسرائیلیوں کے غول کا سامنا ہے۔

اہرام ہم نے تنہا جا کر دیکھے۔ جن صاحب نے ساتھ جانے کا وعدہ کیا تھا وہ ٹال گئے۔ آخر میدان تحریر سے آٹھ نمبر کی بس پکڑی اور سامنے جا اترے۔ ایک زمر نے میں وہاں کھڑے سے کھوا پھلتا تھا۔ اب وہاں فقط دو سیاح تھے۔ ایک ہم ایک کوئی جا پانی صاحب زرا سے۔ یا پھر اسکول کے لڑکوں کا ایک دستہ بیرون قاہرہ سے آیا ہوا تھا۔ اونٹوں والے اپنے اونٹ سے کربہاں حرت بھاگے۔ گائیڈ بھی دوڑے دوڑے آئے۔ ایک نے ہمیں سب سے پہلے آیا اور نعرہ لگایا۔

”جہان ویری گڈ۔ انڈیا ویری گڈ۔“

ہم نے کہا: ”ہم انڈین نہیں ہیں۔“

”ولا! پاکستان آسو گڈ۔ کم آن۔“

یہ نعرہ اس کا اپنا نہیں تھا۔ وہ اپنے ملک کی پالیسی بیان کر رہا تھا۔

”انڈیا ویری گڈ۔ پاکستان آسو گڈ۔“



یہ سامنے خوف کا ہرم ہے۔ سب سے بڑا۔ اس کی سطح چکنی نہیں ہے۔ جیسی
تصویروں میں نظر آتی ہے۔ ایک کے اوپر ایک تھوڑا ہٹا کر چھروں کا ردوار رکھتے
گئے ہیں۔ بعد میں پستہ کر کے سطح ہموار کر دی گئی ہے۔ لیکن وہ زمانے نے الٹا کر ڈالا۔
اب تو پاؤں رکھتے جوتے اوپر جاسکتے ہیں۔ ہم اوپر تو خیر نہیں گئے لیکن اندر پہنچے۔
یہ راستہ جس سے اب اندر جلتے ہیں چوروں نے بنا دکھا ہے۔ جلنے کس زمانے میں
انھوں نے خوف کے مقبرے کے جواہرات اور دولت چرانے کے لئے نقب لگائی ہوگی
اور اس میں کامیاب رہے کیونکہ اٹھارویں صدی کے آخر میں جب پہلی فرانسیسی
مہم اندر داخل ہوئی تو انھوں نے تابوت کے ڈھکنے اور لاش کو غائب پایا۔ اس
چور رستے کی اونچائی نقطہ اتنی ہے کہ آپ جھک کر قریب قریب ٹھنوں کے بل اندر

جاسکتے ہیں۔ آگے سارے رستے میں خاصی تکیہ چڑھائی ہے اور لکڑی کے تختے بچا کر پاؤں ٹھکانے کو پستی بان لگا دئے گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اوپر غزوہ کے مکہ تابوت میں پہنچے تو سانس چڑھ گئی تھی اور وہاں تازہ ہوا کو دخل نہیں تھا۔ سخت گرمی جس اور ہوا کی کمی سے ہمیں اپنا دل ڈونتا محسوس ہوا۔ جی چاہا بھاگ کر باہر نکل جائیں آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں لیکن باہر جانا ممکن نہ تھا۔ باہر کا دروازہ ان آدھ فرائنگ لمبی میڑھیوں اور سرنگ کے اس پار تھا۔ دوسرے لوگوں کے خیال سے ہم نے آراوہ مضبوط کر کے اپنے قوی اور اپنے سانس کو قابو میں کیا۔ ورنہ بے ہوش ہونے میں کسر نہ تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ محتاط لوگ اسی وجہ سے اندر نہیں آتے اور کمزور جسم و جان کے لوگوں کو تو وہاں آنا ویسے ہی منع ہے۔ ہم کمزور جسم و جان کے نہیں ہیں۔ لیکن غلطی یہ کہ سچ سچ اوپر چڑھنے کی بجائے یک دم تیزی سے اوپر چلے گئے۔ اور سانس پھٹا بیٹھے۔

اس تجربے کے باوجود ہم دوسرے دونوں ہرموں کے اندر بھی جاتے اگر جا پاتے، لیکن شام کا چھٹ پٹا ہو گیا تھا۔ لہذا البواہول کی طرف جاتے جوتیشب میں ہے اور روشنی اور آواز کا کھیل شروع ہونے تک بلٹن والوں کے رسیٹوران 'غوفو' میں بیٹھے کافی پیتے، کچھ نہ کچھ کھاتے ٹھونکتے رہے۔ پروگرام کا ٹکٹ خاما ہے تیرہ چودہ روپے لیکن ہے دیکھنے کی چیز۔

ہم نے یہاں دو مصر دیکھے پرانا مصر اور نیا مصر۔ پرانے سے مطلب فرعونوں کا مصر نہیں بلکہ نامصر سے پہلے کا۔ پرانی پود اور نئی پود۔ پرانی نسل چائے خانوں میں

بیٹھی گپ کرتی اور چور کھیتی اور دھوپ تپتی۔ ہم نے تو لوگوں کو دین کے دس بجے بھی کہ ہر جگہ ہر ملک میں کام کا وقت ہوتا ہے نہیں پٹتے، تماش کھیتے پالا، یورپ میں جہاں پانچ کاموں کے لئے ایک آدمی ہوتا ہے۔ یہاں ایک کام کو پانچ آدمی کرتے ہیں دیکھا کہ چار آدمی سڑک پر جھاڑو دے رہے ہیں۔ پانچواں بیٹی باندھنے ان کا وارنہ کھڑا ہے۔ سرباز رکھانے کی چیزوں پر گرد و حول کھیاں بھی کچھ ہیں لوگ نان کو زمین پر رکھ دیتے ہیں اور پھر کھاتے ہیں۔ ڈھیلے ڈھالے ٹخنوں تک پہنچے جوتے کمرے، مٹی میں گھسٹتے جا رہے ہیں۔ ازہر کے اس پاس یا شریف پاشا الکبریا میدان عقبہ میں جائے تو سارا ماحول قرون وسطیٰ کا ہے۔ ہمیں الف لیلے یاد آئی کہ اس کے کچھ قصوں کا محل قاہرہ بھی ہے کبڑا ہونا بھی قاہرہ ہی میں تھا اور بوبک حجام اور اس کے سات بھائیوں کا قصبہ بھی یہیں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ہم نے بھی ایک روز یہاں بال کٹائے لیکن یہ اطمینان کر کے کہ اس شخص کو کوئی ایسی زبان نہ آتی تھی جو ہم سمجھتے ہوں۔ پھر بھی وہ بال کاٹا گیا اور کچھ نہ کچھ قصہ کہتا گیا۔ کوئی کوئی لفظ ہماری سمجھ میں آتا بھی تھا لیکن ہم نے ہونکا را نہ بھرا۔ ہم نے انگلی کی نوک دکھا کر بتایا تھا کہ بس ہمارے بال اتنے سے چھوٹے کرنا۔ زیادہ نہ کاٹ دینا۔ اس نے اتنے کہنے دیتے باقی کاٹ کر ڈھیر کر دیتے۔ ہم نے پھر بھی آفت نہ کی اور پیسے دے کر باہر نکل آئے۔ وہ شخص اٹلا و سہلا۔ اسرائیل۔ ناصر۔ جہاد وغیرہ کرتا ہوا اٹلی کے موڈرٹک ہمارے پیچھے آیا۔ بہت خلوص کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

اور پھر دوسرا مصر ہے نوجوانوں کا۔ ان نوجوانوں کا جو کالجوں سکولوں میں پڑھتے ہیں اور ناصر کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ تعلیم یہاں مفت ہے اور سب

کے لئے دروازے کھلے ہیں تعلیم یافتہ گان کو روزگار بھی لازمی طور پر ملتا ہے۔ فوجی تربیت بھی لازمی ہے۔ بڑی عمر کے لوگوں کو چھوڑ کر کوئی شخص بھی متشنسی نہیں۔ ڈیڑھ سال تک اسے لازماً ٹریننگ لینی پڑتی ہے۔ دفاتروں میں تیز رفتار لڑکیاں کام سنبھالے ہوئے ہیں۔ کارخانوں میں مزدوروں کو کارخانے کی طرف سے دودھ ملنے کا حکم ہے۔ بڑی جائیدادیں ختم۔ بہت سے پیداواری ذرائع اب حکومت کے ہاتھ میں ہیں یا سیاسی پارٹی کی ملکیت یا ادا دہا بھی کے اداروں کی تحویل میں یہی لوگ نئے مصر کی امید ہیں۔ اس روز صدر ناصر نے پارلیمنٹ میں تقریر کی تو ریڈیو پر بھی نشر ہوئی۔ میدان تحریر میں اور سڑکوں پر اسے سننے کے لئے لوگوں کے ٹھٹھٹ گئے تھے۔

اور صدر ناصر کی تقریر بھی بھی عمدہ۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں شکست نہیں ہوئی شکست اسے کہتے ہیں جسے شکست مان لیا جائے۔ کیا ڈنکرک سے انگریزوں کے نکل جانے سے وہ جنگ عظیم ہار گئے؟ لڑائی ہتھیار کی ہتھیار سے نہیں ہوتی بلکہ عزم کی عزم سے ہوتی ہے اور ہمارا عزم ناقابل تسخیر ہے ہمیں کوئی ایسا فارمولا قبول نہیں جو ہمیں اسرائیل کو تسلیم کرنے پر مجبور کرے۔ ہم طاقت جمع کریں گے اور اسرائیل کو عربوں کے علاقے سے نکالیں گے۔ جو چیز طاقت سے چھینی گئی ہے وہ طاقت ہی سے بحال کی جاسکتی ہے۔

صدر ناصر نے ان لوگوں کو بھی لگا کر انہیں جنھوں نے ناجائز منافعوں سے جا بڑا دیں بنا رکھی ہیں اور لکھا سب کا محاسبہ ہوگا۔ سب کی مراعات اور استحقاق ختم۔ یہ محاسبہ صدر مملکت یعنی میری ذات سے شروع ہوگا۔

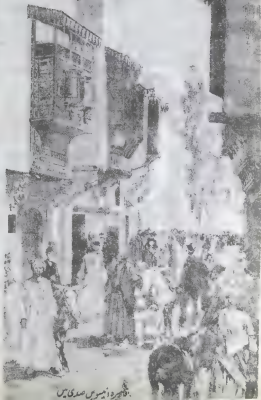
خان خلیل کی ایک شام

یورپ میں ہماری کم خوری اور غم خوری سب کی تلافی سردار انور خاں نے کر دی۔ سردار انور شاہزادہ ہمارے پرانے دوست آج کل قاہرہ میں ہمارے سفارت خانے میں کونسلر ہیں۔ ہمیں خبر نہ تھی کہ یہاں ہیں۔ پچھلی بار بٹے تھے تو برازیل میں تھے۔ اب ملاقات ہوئی تو جیسا کہ پاکستان میں دوستی کے آداب ہیں انہوں نے کہا پھل کے کباب کھائیں گے۔ سردار انور خاں کی دعوت میں خوشی خوشی جانے میں ایک نکتہ یہ تھا کہ ہم ان کو اپنی عزتیں نہ سنا سکتے تھے۔ مارا یورپ گھوم گئے کسی نے رہنما بھی نہ پوچھا تھا کہ صاحب اپنا کلام عنایت فرمائیے۔ شاعر پر یہ وقت بڑا کڑا ہوتا ہے۔ وہ تین مہینے تک مکہ اور وہاں اسبجان اللہ نہ سنے تو اس کی شاعری کا پورا امر جانے لگتا ہے۔

بوسے "کیا کھاؤ گے؟"

ہم نے کہا "نکتہ کھائیں گے"

بوسے "تکے کو یہاں کباب کہتے ہیں؟"



شیراز، ایران، صدک

ہم نے کہا: ”کیا اب بھی کھائیں گے؟“

ہوئے: ”کیا اب کوئیاں کو فٹہ کہتے ہیں؟“

ہم نے کہا: ”کو فٹہ بھی کھائیں گے؟“

اب وہ چپ ہو گئے۔ کہ ہم نے اس کا مصری نام بتایا تو یہ اس کو بھی کھائیں گے۔ ہم نے بہت پوچھا کہ کو فٹہ کوئیاں کیا کہتے ہیں۔ وہ ناں نہی گئے۔

اس شام ہم نے انا کھایا کہ پیدل چٹا دشوار تھا۔ وہ ہمیں ہمارے ہوٹل کے

دروازے پر چھوڑ کر گئے۔ اس سے پہلے بھی ہم نے کچھ کسرنہ چھوڑی تھی۔ بلکہ

سجاد حیدر نے ہمیں چانے پر بلایا تھا۔ وہ جنگ پڑھتی ہیں اور ادب کا بھی وسیع

مطالعہ رکھتی ہیں۔ سجاد حیدر صاحب (ہمارے میٹر) بھی تشریف رکھتے تھے۔

ان سے ہم نے ذکر کیا کہ ہم بغداد جانے کا عزم رکھتے ہیں۔ فرمایا: وہاں تو جب

جاؤ گے سو جاؤ گے۔ وہاں کی مصیاتی یہیں کھلانے دیتے ہیں۔ یہ لویہ من دس لویہ

ہم نے کہا: آپ پر یہ کہاں سے اترا ہے۔

ہوئے: ”اترا نہیں، ایک صاحب لائے تھے۔“

ہم نے کہا: ہوائی جہاز سے لائے ہیں؟ معلوم ہوا: ہاں۔ ہم نے کہا تو

پھر اُترا ہی کہنا چاہیے۔

من سلوی ہم نے مزے رکھا۔ اس کی اوپر کی تہ نرم تھی۔ اندر کی بہت سخت

ہم نے کہا: متن تو ہم کھا سکتے ہیں لیکن یہ اندر سلوا ہے کہ ڈی سلوا۔ یہ ہم سے

نہیں چلتا۔ تب بلکہ صاحب نے فرمایا: یہ آپ کی قسمت میں نہیں ہے تو یہ محو سے

کھائے اور سردار انور خاں کی دعوت میں جانے تک ہم آدمی درجن سو سے

کھا چکے تھے۔

اور اگلے روز عبدالباری انجم نے ہمیں بکوتر کھلائے۔

عبدالباری انجم جیسا کہ ان کا نام کہے دیتا ہے۔ شاعر ہیں۔ دس بارہ برس سے قاہرہ میں مقیم ہیں۔ ریڈیو پر چیف ناڈسٹر ہیں۔ ہماری آمد کا مضمون ہوا تو ازراہ مہربانی منے آئے۔ ہم نے کہا، میاں انجم! اب ہمارا ایک دن باقی ہے۔ تمہاری یونیورسٹی الانہر ہم نے دیکھ لی۔ ابراہم کو سلام کر آئے۔ لیکن صلاح الدین ایوبی کا قلعہ نہ دیکھا۔ محمد علی کی مسجد نہ دیکھی۔ کراچی کے لوگ ہم سے باز پرس کریں تو ہم کیا جواب دیں گے۔ اپنا ایک دن ہمارے ساتھ خراب کرو۔ ہم تمہارے شعر بھی نہیں گئے۔

بولے "بازار خاں خلیل بھی گئے آپ؟"

ہم نے کہا "ایک بار دیکھا ہے۔ دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ لیکن پہلے

قلعہ و مسجد۔"

اور وہ دن اور وہ شام ہم نے پرانے قاہرہ کی گلیوں میں گزرا۔ غالیوں کے

عہد کی مسجدیں، مملوکوں کے عہد کی مسجدیں، رفیع الشان، پرہیزگار اور پھر وہ قلعہ۔

ہاں اسی ڈیوڑھی کی اسی محراب تلے سے صلاح الدین ایوبی اپنے سہمہ پر سوار گزرتے

ہوں گے۔ ان فیصلوں پر ان کے سر شلوں کی نشست ہوئی قلعہ کی شکست

دور دیوار نے افسانے کہنے شروع کئے۔ سطوت رفتہ کے جلیبیوں سے معرکہ

آرائی کے۔ اور نیچے ان کے بھائی کی بنائی ہوئی مسجد ناصرہ کھڑی تھی اور مجھے عظم

کی سپاڑیاں تھیں اور سارا قاہرہ دور تک نظر آتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک جگہ سے نیل بھی جھلکتا تھا۔

قاہرہ کی پرانی مسجدوں میں سے جامع الازہر اور سیدنا حسینؑ جہاں حسین علیہ السلام کا سر دفن ہونے کی روایت ہے۔ اپنی الگ شان رکھتی ہیں مسجد رفاعی ان سے الگ ہے۔ اس کے صحن میں چار بڑی محرابیں ایک دوسرے کے بالتقابل ہیں جن میں اسلام کے چاروں مسلمانوں کے در سے تھے لیکن قلعہ ایوبی کے اندر محمد علی کی مسجد باغلی ہاتھوں کی مسجدوں کے نمونے کی ہے۔

محمد علی پاشا، شاہ فاروق کا پروردار ترک تھا اور عثمانیوں کی طرف سے قاہرہ کا گورنر۔ لیکن پھر خود مختار ہو بیٹھا۔ اس کے خدام بھی ترک تھے اور عربی نہیں جانتا تھا اس مسجد میں مقبول کی مسجدوں کا شکوہ نہیں لیکن نمونہ وہی ہے اور پیچھے اس کا محل۔ یہ محل کوئی بہت رفیع الشان نہیں لیکن اندر سے اچھا خاصا ہے محمد علی پاشا کو ملوک سرداروں کی مشورش کا بہت ڈر رہتا تھا۔ کیونکہ جس گدی پر وہ بیٹھا تھا۔ وہ ایک وقت میں انہی کی تھی۔ آخر ایک روز اس نے ان کی دعوت کی۔ ناؤ نوش کا دور چلا۔ ایک طرف شادیانے بچ رہے تھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی بلوک سردار رکھا نا کھا کر ایک ایک کر کے اُتھ دھونے کے کمرے میں جاتے تھے اور پھر واپس نہ آتے تھے کیونکہ وہاں جلا دتیغ لئے کھڑا تھا جو داخل ہوتا تھا۔ اس کا سر قلم ہو جاتا تھا اور کوئی آواز ہوتی بھی تھی تو باجوں اور سازوں کے شور میں دب جاتی تھی۔ تین سو آدمی تیغ کے گھاٹ اترے۔ فقط ایک بچا جو معاملہ بجانب کردیوار پھانڈ نکلا۔

اور ہم نے وہ ال کمرہ دیکھا جس میں یہ دعوت ہوئی تھی اور وہ کمرہ دیکھا جس میں انہوں نے جام اجل نوش کیا تھا اور محمد علی کا موی بت صدر میں بیٹھے دیکھا

جس کی دوبالشت لمبی سفید وارھی تھی۔ اور اس کے بیٹے ابراہیم پاشا کا بت دیکھا جس نے نجد میں وہابیوں پرستم ڈھائے تھے اور ان کی بغاوت کو کچل تھا اور اور پھر اس کے پوتے شاہ فاروق کو تو نڈنگائے چمٹہ لگائے کہری کے ساحل پر ایک حینہ سے پھل کرتے دیکھا اور پھر اس کی گناہ موت کی خبر اخبار میں پڑھی۔

بازار خان خلیل جامع الازہر اور مسجد سیدنا حسین کے عین سامنے واقع ہے یروشلمی ٹیرھی تنگ گلیوں کا گورکھ دھندلوا اور حجابانہ کی طرف نکل گیا ہے جہاں کا تعلق جمال سے نہیں بلکہ حمل یعنی اونٹ سے ہے۔ کیونکہ مصر کی غورتوں میں ہم نے خوبصورتی کا زیادہ رواج نہیں دیکھا۔ یہاں اونٹ اور ان کے محل اور ان کے غمرے ہوتے تھے۔ اس میں ایک بازار زیورات بنانے والوں کا ہے۔ ایک کسروں اور شیعروں کا ہے۔ کچھ تھیں اور مسی برتن بیچنے والوں یعنی نحاس کی سی لگیاں ہیں۔ پچ پچ میں لوگندے یعنی ہوٹل ہیں۔ اس زمانے میں چھتے ہوئے بازار ہوتے تھے۔ تاجرہ، دمشق، اصفہان اور بغداد میں ان کی باقیات اب بھی ہیں۔ خان خلیل میں کچھ عرابین کچھ دروازے اور کچھ کڑیاں اس بازار کی نشانی ہیں۔ اب یہاں ٹورسٹ آتے ہیں (عرب ہیں انھیں سیاح نہیں بلکہ ساج کما جاتا ہے) اور حسب مقدور ٹٹتے ہیں۔ جنگ کے بعد سے ان بازاروں میں رونق نہیں رہی۔ ہم ایسا کوئی بے مردمان بھی گزرتا ہے تو ہمیں دکاندار پکتے ہیں۔ ویکم سر سودیمر۔ میاں انجم کو سامنے الازہر میں پڑھ کر عالم و فاضل ہوئے ہیں، قیام بھی یہیں رکھتے تھے اس لئے بہت سے دکانداروں سے ان کے اہل سہلا اور توڑا

کے تعلقات ہیں۔ تاہم کا عمارہ روزمرہ اہل عرفہ کی زبان سب خوب جانتے ہیں۔ دکانداران کی وساطت سے جہیں اوجار تک دینے پر آمادہ تھے۔ لیکن ہم شخص میں نہ آئے اور بھرے پڑے بازاروں سے بیگانہ وار گزر گئے۔ میدان حسین سے اوجہ کو اس بازار میں داخل ہوں تو ایک پرانے زمانے کا بٹھا دھننے ہاتھ کی دوسری دکان میں بیٹھا ملے گا۔ نسوار فروش ہے۔ اور اس کی کائنات چند رنگ آلود ہے ہیں۔ دنیا کا فیملی سے بے نیاز ان ڈوبوں کی طرف منہ کیے تسبیح پڑھتا رہتا ہے۔ ہم کئی بار خاص اسے دیکھنے کو ادھر سے گزرے۔ وہاں کسی خریدار کو رکتے نہ دیکھا۔ اس نے ہماری طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ پھر چراغ جلے اور ساری دکانوں پر روشنیاں ہوئیں۔ اس کی دکان پر روشنی بھی نہ ہوئی۔ ہم نے قریب جا کر دیکھا تو الفیل کے اس کردار کو اسی طرح میلے کپڑوں میں سلنے نظریں لٹکائے تسبیح کرتے پایا۔

انجم صاحب ہوئے : دیکھ لیا بازار خان خلیل ؟

ہم نے کہا : ہاں۔ اب تو ناخستہ اڑانے بلکہ ناخستہ کھانے کو بھی چاہتا ہے کیونکہ بھوک لگی ہے :

ہوئے : ناخستہ تو نہیں : کیوتر ملیں گے۔ ادھر آدین الازہر کے سامنے ٹرک کی ٹکڑ پر بیٹھیں گے۔ کیوتر کھاؤ اور بازار کی سیر دیکھو :

اور اس ٹکڑ کی دکان کے سامنے باہر کرسیوں پر بیٹھے کیوتر کھاتے ہم نے تاہم کی آخری جھلکیاں دیکھیں کیونکہ اگلی صبح ہماری رخصت کی صبح تھی۔ لوگ بال اتنے جاتے ہوئے چلیں کرتے ہوئے ————— وہ ماچیں بیٹھا ہوا بڑھا جس کی ایک بھی ہنس

ہمارے سامنے تو بکی نہیں۔ وہ شخص جس نے اپنے گدھے پر مویاں بار کئے ہوئے کئی بار اس گلی کے چکر کئے۔ آخری بار تو صرف دو گچے رہ گئے تھے۔ ایک مٹی حسینہ دکانداروں سے ششمال کرتی اور ہمیں آٹھ مارقی، اپنا لانا کرتا گھسیٹتی چلی گئی۔ اور شب کے سائے گرے ہوتے گئے۔

آپ تاہم جانیے تو ہماری طرف سے اس بڑے کو ضرور دیکھئے کہ فسقار کی دکان پر بیٹھا جانے کب سے تسبیح کئے جا رہا ہے اور یہاں کیو تر کھانے کو ٹھکی بیٹھے پہچان اس کی یہ ہے کہ یہ بازار کا سب سے موٹا دکاندار ہے، وہی بھر سامنے کرسی ڈالے اپنے بے کرتے میں بیٹھا ملے گا۔ ہمارے بیٹے بیٹے دس پانچ آدمی اور بھی اس کی ٹکڑے گزرتے تھے کہ بعض صنعت نازک کے فرد بھی۔ اب ہماری سمجھ میں آیا کہ مصری ایرانی، یونانی، عرب ایرانی کی سیٹوں کی پیٹیاں دوسری ایرانیوں کی نسبت دگنی دگنی ہی کیوں ہوتی ہیں۔

لبنان و شام

۱۹ نومبر تا ۵ دسمبر ۱۹۶۷ء

بیروت کی باتیں

سادھوؤں، سنتوں اور ولیوں وغیرہ سے ہمیں عقیدت تو ہے لیکن اتنی بھی نہیں کہ ان کے بغیر نوالہ بھی نہ توڑ سکیں۔ لیکن یاروں کو تجھ سے حالی کیا خوش گمانیاں ہیں جنیوا کے ہوٹل ST. GERVAIS یعنی ساں یروس کے بعد ہماری کوشش یہ رہی کہ لاویچی یعنی سیکورم کے ہوٹلوں میں رہیں۔ قاہرہ میں بھی جہاں لوگ اسلامیات کی سند لینے اور کباب تلے کھاتے جاتے ہیں۔ ہمیں اٹالوی جیسیائیوں کے ایک ہوٹل گارٹون مٹی (جاردون مٹی) میں رہنا پڑا۔ اور سپا گھٹی یعنی اٹالوی سویاں کھانی پڑیں۔ بلکہ نہ کھانی پڑیں کیونکہ ہم انھیں چھڑی سے اپنے کانٹے پر رکھتے تو تھے لیکن وہ منہ تک کاٹا آنے سے پہلے ہی پھسل کر پھر ٹیٹ میں جا رہتی تھیں۔ اب یہاں بیروت میں.....

ہوا یہ کہ ہمیں یہاں پہنچتے ہی چارے میز بانوں میں سے ایک نے کہا کہ ساں ہیل ہوٹل میں چلے جاؤ۔ ہم نے کہا ہم آہل مجھے مار کے قائل نہیں۔ ہمیں تو قاہرہ میں پوڈیر محمد حسن الاعظمیٰ نے مشورہ دیا تھا کہ فندق سفیقہ العبدید میں جانا۔ گھر کا سا آرام ملے گا۔

ہم نے پروفیسر صاحب سے کہا کہ اس ٹکٹے پر زور نہ دیجئے۔ ہم ایسے بے شمار ہوٹلوں میں ٹھہر چکے ہیں جہاں گھر کا سا آرام ملتا رہا ہے یعنی دروازے میں چابی نہیں لگتی۔ بستر کی چادر کئی کئی دن نہیں بدلی جاتی۔ کوئی بیراجھاری آواز پرکان نہیں دھرتا۔ ہمیں تو کوئی اچھا ہوٹل چاہیئے۔ گھر کا سا آرام مطلوب ہوتا تو گھر سے نکلتے ہی کیوں؟ یورپ کیوں آتے؟ لیکن پروفیسر صاحب کی تاکید یہی رہی کہ اسی ہوٹل میں جانا۔ واقعی آرام وہ ہے۔ سب سے بڑا آرام تو یہی ہے کہ سستا ہے۔

پس ہوٹل ساں ہل پر ہم نے اعتراض کیا کہ اس کے نام سے چوپالیوں کی بو آتی ہے۔ ہمیں یہ نکتہ بتانے میں خاصی دیر لگی۔ اور خاصی لغت چھانٹی پڑی۔ لیکن پھر کسی نے لکھ کر بتایا کہ ساں ہل نہیں ساں ہل۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے کسی لفظ میں ج یا ق یا ط ظ وغیرہ آجائے تو ہم مطمئن ہو جاتے ہیں کہ عربی اور اسلامی چیز ہے اسی لئے پورس کے مقابلے میں ہمارا رجحان سکندر اعظم کی طرف زیادہ رہا۔ سکندر اعظم ہی نہیں۔ ارسطو۔ افلاطون۔ بقراط۔ اعلیوس۔ نیشا غورث وغیرہ کو ہم نے ہمیشہ مسلمان ہی جانا۔ ساں پر تو ہم نے غور نہیں کیا۔ بلبل کی رع پر ہم چپ ہو گئے۔ لیکن جب ہم ہوٹل پہنچے تو معلوم ہوا یہ تو سینٹ پال کا ہوٹل ہے یعنی یہاں بھی کلیسا مرے آگے۔ اب بیٹھو اور انجیل کا باپ کرو۔ ممکن ہے ہم سینے پر صلیب کا نشان بنا کر اس وقت بھی رخصت ہو جاتے۔ ہم ایسے گنہگاروں کا سینٹ پال جیسے برگزیدہ ولیوں سے کیا کام لیکن ایک تو ہم تھکے ہوئے تھے دوسرے عین اس کے احاطے کی دیوار کے ساتھ لائٹ ہاؤس یعنی المنارہ نظر آیا چونکہ ان دونوں ہم تقاضائے بشریت سے بہت کام لے رہے ہیں۔ یعنی

راستہ فوراً بھولتے ہیں۔ اس لئے یہ نشان غنیمت معلوم ہوا جہازوں کے لئے بنایا گیا ہے لیکن ہمارے بھی کام آسکتا ہے۔ ہمارے زبان کا حکمی علاج بے شک نہیں ہے کیونکہ بن کو ڈوبنا ہے ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں۔ تاہم خیر.....

دم تحریر رات کے دس بجے ہیں اور ہم اپنے سوٹ کیس میں اپنی فرنچ زبان کی ڈکشنری ڈسمنڈر ہے ہیں۔ تاکہ ہاتھ منہ دھو سکیں تفصیل مگس کے باغ میں جانے کی یہ ہے کہ تھوڑی دیر پہلے ہم نے دیکھا ہمارے کمرے میں تو یہ کوئی رکھا ہی نہیں گیا۔ صابن ہم اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ لیکن تو یہ تو مسز ابرز کے ہوٹل





ملک میں ملتا تھا۔ خواہ چادر گرہ کا تھا۔ یہاں تو ہم نے کمرہ بھی ایسا یا تھا جس کے ساتھ اپنا ذاتی غسل خانہ ہے۔ اگرچہ اس میں ٹب نہیں ہے اور شیشہ اتنا اونچا لگا ہے کہ ہم جیسے خالصہ اونچے آدمی کی صرف آنکھیں اس میں نظر آتی ہیں شاید صرف بالوں میں لٹکھا کرنے کے لئے رکھا گیا ہے تاکہ لوگ بیجا طور پر ہارسنگھا میں وقت ضائع نہ کریں۔ ایک نظریہ ہمارا یہ ہے کہ یہ کمرہ ڈاڑھی والے پادریوں کے لیے بنایا گیا ہے۔ ہم ایسے ڈاڑھی مونڈنے والوں کے لئے نہیں۔ خیر صبح سٹول پر کھڑے ہو کر شیو کر لیں گے یا دل کے آئینے میں خود کو دیکھ لیں گے۔

ہم اطمینان سے کپڑے اتارے بیٹھے تھے تو یہ کہ لئے ٹیلی فون اٹھایا تو نیچے سے عربی سنائی دی۔ آخری تیلون پہنی کوٹ پہنا۔ جوتا پہنا۔ نائی لگائی اور نیچے ہوٹل کے دفتر میں گئے۔ ہم نے کہا۔ تو یہ چاہیے مادل۔
 وہاں جھڑکا تھا۔ بس بیٹھا رہا۔ بولا تو عربی بولا۔

بروت میں عربی چلتی ہے اور فرنج۔ عربی ہماری مذہبی زبان ہے اسے ہم دنیاوی کاموں میں لانا پسند نہیں کرتے اور فرنج بے شک ہم بہت سی جانتے ہیں لیکن جس طرح اپنے کاغذات کو اپنے تھیلے میں اور کپڑوں کو سوٹ کیس میں رکھتے ہیں۔ اس طرح اپنی فرنج کی بیات کو بھی ہم نے اپنی ڈکٹری اور فرنج بول چال کی کتاب میں رکھ چھوڑا ہے تاکہ ذہن میں مختلف زبانوں کا جھوم نہ ہو جائے اور مزید علم کے لئے اس میں گنجائش رہے۔ ہم نے لڑکے کو اشارے سے ہاتھ دھو کر دکھاتے۔ اس پر وہ صابن کی ایک ٹکیہ نکال لایا۔ ہم نے کہا یہ نہیں۔ اور خیالی تویہ سے اپنا جسم رگڑ کر دکھایا۔ شاید وہ ہمیں ورزش کا شوقین سمجھا۔ کیونکہ الماری کھول کر ڈبوں کی ایک جوڑی نکال کر رکھ دی۔ دیوے ہو کر ہم اور اپنے کمرے میں آئے۔ تجویزی تلاش سے جرمن ڈکشنری مل گئی اور اس میں تو لے کے لئے HAND TOUCH کا لفظ بھی نوٹ کر کے لے گئے کہ جرمنی آفرانس کا جسیا ہے۔ لیکن بے کار۔ اگر فرنج ڈکٹری نہ مل۔ شاید کیس پولینڈ یا مصر میں ہم بھول آتے ہوں تو ہمارا حال تو دن و رات کے پار یوں اور عیسائیوں کا سا ہو گا کہ نہانے دھونے کو مسلمانوں کی بدعت جانتے تھے جسم سے پسینے کی بو آتی تھی تو بس پوڈر چھڑک لیتے تھے۔ کل بازار جائیں گے تو یا تو تویہ خرید لائیں گے یا پوڈر کا ڈبہ۔ ان میں سے جو بھی چیز سستی ملی۔

کل رات اوپر کی سطریں لکھنے کے بعد ہم نیچے گئے تو آخر دفتر میں مونچھوں والے ایک پہلوان مل گئے جو شاید ہوٹل کے منیجر ہیں۔ تو لے کے ذکر پر لڑکے سے بولے :-

”اے جاہلہ! کے قول یہ دے صاحب کو“

وہ مسکراتا ہوا گیا اور کسی ٹنگے میں سے ایک دو مال سا نکال لایا۔ ہم نے کہا اس سے تو ہم ایک لکھ پونچھ لیں گے دوسرے کا کیا کریں گے۔ اس پر ایک اور ڈال غایت ہوا۔ ہم نے شکریہ ادا کر کے اور پاؤں پھیلانے اور کہا ہمیں گرم پانی بھی چاہئے شکر کرنے کو اور بندہ بشر ہے۔ کبھی نہانے کو بھی جی چاہتا ہے۔ خصوصاً جبکہ غسل خانہ کمرے کے ساتھ لگا ہو۔ اس نے کہا اس قسم کی ہر وقت گرم پانی نہانے کی عیاشی تو وطن وغیرہ میں ہوتی ہے۔ ہم تو صبح ساڑھے سات بجے کے بعد گرم پانی ٹی میں چھوڑتے ہیں۔ ہم نے کہا — اچھا! آپ کی بڑی مہربانی، لیکن دیکھئے چھوڑیئے گا ضرور۔“ صبح آنکھ تو ہماری جلد کھل گئی لیکن لیٹے ساڑھے سات بجے کا انتظار کرتے رہے۔ لیٹان میں اب گرمی نہیں ہے۔ ہم اپنا مٹا سوٹ نہ پہنیں تو سردی لگتی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے یہ لوگ ابھی تک ہمارے کمرے کے ٹوں کی ٹنگی میں برف کی سل ڈالتے ہیں۔ ہم نے ساڑھے سات بجے ٹی کھولا اور کھولے رکھا۔ کچھ فرق نہ پایا۔ آٹھ بجے کے قریب معلوم ہوتا ہے ان لوگوں نے برف نکالی اور اب خالی ٹھنڈا پانی رہ گیا۔ لیکن ہم نہانے پر تلے ہوئے تھے نہانے کے رہے۔

اور یہ بھی ہم عرض کر دیں کہ شیخ توحید کے پروانے ہونے کے باوجود یہ باقی ماندہ دن غالباً ہم ہوٹل سینٹ پال میں گزاریں گے کیونکہ آج دوپہر مسلمانوں کے ہوٹل فندق سقنقور الجدید ہوتے ہیں۔ یہ یہاں کے ڈاؤن ٹاؤن ساتھ الشدائیں واقع ہے۔ ڈسٹرکٹ میں خاصی دیر تھی کیونکہ ہر مکان کی ہر منزل پر ایک سٹے ہوٹل کا بورڈ ہے وہاں لی باریکٹ کے نواح کا نقشہ نظر آیا۔ اتنی گڈگی تو ہم برداشت کر لیتے ہیں۔

جتنی پاکستان میں ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ کی عادت نہیں غسل خانے کے کمرے کے ساتھ ہونے کی بات تو دُور رہی۔ وہ تو دو مسافروں کو ایک کمرے میں رکھتے ہیں تاکہ باہم محبت بڑھے۔ قدرِ عاقبت معلوم کر کے ان کا کارڈ لے کر ہم آگئے لکھا ہے "یتوفر فیہ للمسافر کل اسباب الراحة نظافة خادقه معاملت جیدة۔ حمامات ضمن الحرف باسعار لائزاحم۔"

ہماری سمجھ میں اس میں سے فقط اسبابِ راحت اور حمام وغیرہ کے لفظ آئے یعنی وہ چیزیں جو ہم نے وہاں نہ پائیں۔

یہاں مشرق وسطیٰ میں ایک چیز البتہ ہم نے ایسی پائی کہ ہمارا وطن واپس جانے کا اشتیاق کمزور پڑ گیا ہے۔ قاہرہ اور بیروت کے لوگ جو ہر شناس ہیں ہر جگہ ہمارا تعارف استیادانِ انشا کے نام سے ہوا۔ ہمارے ملک میں ذاتِ پات کو لوگوں نے موردِ تنہا گیر بنا رکھا ہے اگر آپ تیار پیدا ہوئے ہیں تو آپ کو سید مانیں گے ورنہ نہیں۔ اچھے بھلے لوگ عمر بھر موچی کے موچی رہتے ہیں۔ ہم عالمِ عرب سے اپنے سید ہونے کی بہت سکا شدات اپنے ساتھ لارے ہیں کیونکہ مصنفی کی جائے تو زیادہ مستندانِ لوگوں کا فرمایا ہوا ہے۔ سادات کا آغاز ادھر کید عرب ہی میں ہوا تھا۔ ہندوستان پاکستان کے لوگوں کو اس قسم کا حکم لگانے کا کوئی حق نہیں۔ انجن سادات امر وہ اور ولیفہ المومنین وغیرہ کہ چاہیے کہ ہمارے ہم کی مہربانی کی پرچہ رکھیں ورنہ ہم اگر فساد چاہیں گے۔ استغاثہ کریں گے اپنے ایسے علم سیدوں کو اپنے ساتھ ملائیں گے پاکستان میں ان کی تعداد موردِ تنہا سیدوں سے کم نہیں ہے۔

دشقی میں عشق

پہلی رمضان کی افطار ہمیں طرابلس اشام میں صلیبیوں کے قلعے اور مسجد خالد بن ولید کے آس پاس ہوئی اور دوسری رمضان کے چاند نے ہمیں دشقی کی تنگ تاریک محرابی پھتوں والی گلیوں میں گھومتے پایا۔

یہ دن اتوار کا تھا اور بیروت میں بارش ہو رہی تھی۔ اپنی طرف سے تو ہم نے بہت جلدی کی۔ لیکن ساتھ ابرج کے ٹیکسی وائے کے لئے پہلی سواری ہم تھے اور باقی چار کی تلاش میں وہ ہمیں غمچہ دے رہا تھا کہ بس پانچ منٹ میں چلتے ہیں۔ اس تاخیر پر ہم نے جو غصہ انا را وہ انگریزی میں تھا۔ ہمارے جی کا خیابان کچھ دھلا اور ٹیکسی والا بے مزہ بھی نہ ہوا کیونکہ وہ یہ زبان نہ جانتا تھا۔ ہم نے کئی بار ٹکٹ واپس کرنے کی کوشش کی کہ کسی دوسری ٹیکسی میں چلے جائیں لیکن یہی زبان کی وقت حائل رہی۔ ناچار ٹیکسی وائے کے ساتھ ہم نے بھی مسافر ڈھونڈنے شروع کر دیئے کسی شخص کو آتا دیکھتے تو آواز لگاتے 'دشقی! دشقی! دشقی! بھائی دشقی! اسے میاں دشقی چلو گے؟ ایک سوری دشقی کی! وہ سر ہا کر آئے بڑھ جاتا ہمیں سخت

بھجھنچلا ہٹ ہو رہی تھی کہ دمشق اتنی اچھی جگہ ہے۔ یہ لوگ جاتے کیوں نہیں۔
 یہاں کیوں گھوم رہے ہیں۔ ہم دوبارہ اپنی انگریزی کی دھارتیز کر رہے تھے کہ
 تین عورتیں بظاہر بارشش سے بچنے کے لئے سائبان کے نیچے آکھڑی ہوئیں
 ایک موٹی اور خاصی عمر کی۔ دوسری جوان گود میں بچہ اور تیسری ایک لڑکی جسے
 دیکھتے ہی ہم نے فرما حضرت شیخ سعدی سے کہ ہمارے غائبانہ پیر وہی ہیں
 فرمائش کی کہ یہ ہماری ہم سفر ہو اور لالچ بھی دیا کہ آپ کے نام کی پانچ پیسے کی
 ریوٹیاں بانٹیں گے۔ ہم ایسے مستجاب الدعوات کبھی بھی نہ تھے۔ بلکہ ہمارے معاملے
 میں دعا کو اثر کے ساتھ اکثر دشمنی رہی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے اس وقت باب
 رحمت غلطی سے کھل گیا تھا۔ یا حضرت سعدی ریوٹیوں کے پھیر میں آگئے۔ اس
 لڑکی نے کہا: ”تین ٹکٹ دمشق کے“

یا تو ہمیں ایک لفظ عربی کا نہ آتا تھا یا پھر زبان ایسی رواں ہوئی کہ ہم راستے
 بھر یعنی دمشق تک مس فریاں الدنی سے عربی میں باتیں کرتے گئے۔ اس کو انگریز
 کے صرف دو لفظ آتے تھے: ”دیر ہی نائس“ (بہت عمدہ) چنانچہ ہماری عربی پر
 بھی انھوں نے یہی برتے۔ بھلا ہو مولوی محمد حسن کا۔ اگر زندہ ہیں تو اللہ ان کو
 فوج کی عمر عطا کرے۔ ورنہ کم از کم اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ عربی پڑھاتے
 ہوتے ہیں چودہ کے چودہ نیٹے ایک سانس میں دہرانے پر مجبور کرتے تھے۔ آج
 وہ کام آئے اور چند الفاظ عربی کے۔ لا۔ نعم۔ اجل جائز۔ فی۔ عن۔ شکراً۔ طیب
 وغیرہ نے بھی بڑی مدد دی۔ یہ شامی لڑکی تھی۔ یہ بادام سی آٹکیاں اور یہ سیب کے

سے گلابی گال نقش موٹے موٹے تھے۔ لیکن دلاویز اور صحت مند اور مسکرامٹ اور شیریں آواز تو ان فوٹوش میں عجب رنگ بھر دیتی تھی، اس نے بتایا کہ یہ نیچے والی میری اخت ہے یعنی بہن۔ ہم نے کہا اور یہ بڑھیا تمہاری میں ہوگی۔ بولیں۔ نہیں یہ میری خالہ ہیں۔ آگے چل کر ٹیکسی کو ایک گلی میں ٹھہرایا تو ایک شخص جس کے چہرے پر خشونت اور مونچھوں کی فراوانی تھی سوار ہوا۔ یہ مس فرمال کا بھنوٹی تھا۔ اس کو دیکھ کر ہماری رطب اللسانی میں تھوڑا سا فرق ضرور پڑا۔ لیکن ہم نے ہمتیار نہ ڈالے۔ مس فرمال دمشق میں طالب علمی کرتی تھیں۔ ہم نے کہا۔ ہم بھی طالب علمی کرتے ہیں اور کاتب ہیں۔ کاتب حضرات برائے نام ہیں کہ ہم خوشنویسی در اور غلط نویسی سیکھے بغیر ان کی صفوں میں گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ عربی میں کاتب ادب کو کہتے ہیں۔ خواہ وہ ہم ایسا بدخط اور شکستہ خط ہی کیوں نہ ہو۔ عربی بولتا پا کر ان کی خالہ بھی عربی کے ٹانگے لگانے لگیں۔ لیکن ہم نے ان پر کچھ اعتنائے کی۔ زبان حال سے کہا تو یہی کہا کہ چپ رہو بڑی بی۔ ہمیں اتنی عربی نہیں آتی اور جوا آتی ہے وہ فرمال بانو کے لئے ہے۔ ہم فقط ماہ رخوں کے لئے مصوری سیکھنے والے لوگ ہیں۔

بیردت سے نکلنے کے گھنٹہ بھر بعد جبل لبنان کی چڑھائی شروع ہو گئی اور پھر تو ہم اوپر تھے اور بادل نیچے وادی میں۔ سردی بھی شروع ہو گئی تھی۔ شطورہ نامی قصبے میں ٹیکسی رکی اور یہ لوگ کہ روزہ رکھے ہوئے تھے کھانے پینے کی چیزیں پھل پھلاری وغیرہ خریدنے کے لئے رکے۔ فرمال نے ہم سے کہا۔ آپ کچھ نہ کھائیں گے۔ ہم نے کہا۔ نہیں۔ بولیں روزہ ہے؟ ہم نے کہا، ہم سفر

میں ہیں، روزہ نہیں ہے۔ تھوڑی دیر میں ہم بھی نکل کر دکان پر چلے گئے اور اپنے لئے کچھ سیب پسند کئے اور پیسے دینے کو جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس بانو نے روک دیا کہ پیسے ہم دیں گے۔ ہم نے کہا اسے جان قیس! تو چاہے تو ہمیں بے دام خرید سکتی ہے۔ پیسوں کا کھف نہ کر۔ لیکن نہیں۔ ہمیں یہ سیب قبول کرنے پڑے۔

فریال کی نشست ہمارے ساتھ نہیں تھی، ہم تو چھ کھڑکی کے ساتھ بیٹھے تھے ان کی بڑھیا خالہ کے سایہ عاطفت میں۔ فریال آگے کی سیٹ پر ہمارے بالقابل اس کے ساتھ اس کا تعاب نامہ بنوئی اور پھر ڈرائیور۔ لیکن وہ روکی ایسی تھی کہ سارا وقت چھ کھڑکی کو منہ کئے بیٹھی رہی۔ بات بے بات اس ملائت اور اپنائیت سے دیکھ لیتی تھی کہ بس۔

بولیں : کے روز رہو گے دمشق میں ؟

ہم نے کہا : اے دختر شام! ہم مسافر ہیں۔ آج رات چلے جائیں گے واپس۔ یا زیادہ سے زیادہ کل۔ کیونکہ اب ہماری واپسی کا دن قریب آ رہا ہے۔ ہمارا دامن خیال مت پکڑ۔ اس قسم کی دلبری کا کچھ فائدہ نہیں۔ لیکن وہ اس پر مصر رہی کہ دمشق سے آج مت جانا۔ کم از کم دو دن رہنا۔ ہم نے کہا۔ اچھا جو حکم اس کے پاس اس کی تصویریں تھیں۔ ہم نے ایک مانگی تو اس نے اپنے بنوئی کی طرف آنکھ کا اشارہ کیا کہ اس سے خبردار۔

اور پھر دمشق آگیا۔ جہاں یاروں نے عشق فراموش کر دیا تھا۔ محض اس لئے کہ غدا قحط سالی ہو گئی تھی۔

ہم دمشق کے چوک میں ٹیکسی سے اترے ہی تھے کہ ایک شخص بھاگا بھاگا آیا۔ بھڑو؟ بھڑو؟

ہم نے کہا: "میاں ہم تو ابھی دمشق آئے ہیں تو ہمیں بغداد کیوں دھکیل رہا ہے۔" وہاں دھرا کیا ہے۔ بھڑا بکر کے اور امر دے کے۔
بولتا: زیارت؟

ہم نے کہا: "لا۔ یعنی اگر زیارت کرنی ہے تو تیری ضرورت نہیں۔
ہاں ہمیں فندق عدن کا پتہ بتا دے۔"

فندق عدن کا نام ہمیں پروفیسر حسن الاعظمی صاحب نے قاہرہ میں دیا تھا اور اس کے مالک ایک سیالکوٹی ہیں۔ مدت سے یہاں مقیم ہیں۔ لہذا عبداللہ ہندی لکھاتے ہیں۔ ہمارا اداوہ تھا کہ رات رہنی پڑی تو ان کے فندق میں رہیں گے۔ ورنہ دعا سلام تو کریں گے ہی۔ ان سے زیارت گاہوں کا پتہ مقام وغیرہ پوچھیں گے۔
اس شخص نے کہ نام تو اس کا سیلمان تھا لیکن شکل اس کی ہڈی تھی۔ ہم سے کہا: "فندق عدن؟ اچھا میں بتاتا ہوں۔"

ہمارا خیال تھا وہ انگلی سے اشارہ کر کے بتا دے گا یا چند قدم چل کر ہماری رہنمائی کر دے گا۔ اور ہم شکرا کہہ کر آگے چل دیں گے۔ لیکن اس نے ہمیں آگے پہنچنے کا موقع ہی نہ دیا۔ ہم کافی تیز چلنے بلکہ بھاگنے والے آدمی ہیں لیکن وہ تو ہڈی کی طرح سجد کرتا ہوا چلتا تھا۔ چوک پار کر کے ایک گلی — ایک سے دوسری حتیٰ کہ کوئی ڈیڑھ فرلانگ دور ہمیں لے گیا اور بولا:

"یہ رہا۔ فندق عدن۔" باہر لکھا تھا۔ فندق قصر عدن۔

ہم نے اندر جا کر پوچھا۔ بھلا اللہ ہندی صاحب ہیں؟
 وہاں ایک صاحب بیٹھے حقہ پی رہے تھے اور شاید شعر کہہ رہے تھے۔
 بولے وہ تو کہیں باہر گئے ہوتے ہیں۔ آجائیں گے۔ آپ کو کمرہ چاہیئے؟ کمرہ
 لے لیجئے۔

ہمارے پاس سامان تو کچھ تھا ہی نہیں۔ ہم نے کہا۔ اچھا ہم پھر آئیں گے۔
 اب میاں بہ بد پھر سڑک پر پھدکنے لگنے۔ وہ آگے آگے ہم پیچھے پیچھے۔
 ہم نے کہا۔ اے حضرت کدھر؟ بولا۔
 ”جامع اموی۔ سوقِ حمیدیہ“

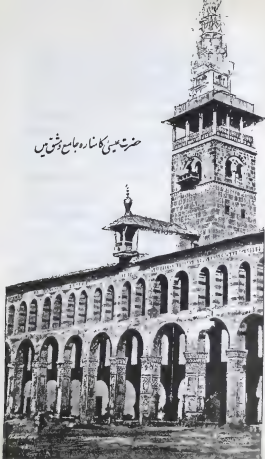
جہیں ان جگہوں پر جانا تو تھا ہی۔ سوچا ٹھیک ہے کچھ مے دیں گے اسے۔
 وقت بچے گا۔ ورنہ ہمیں بتایا گیا تھا کہ سوقِ حمیدیہ یعنی دمشق کا قدیم بازار یہ سامنے
 ہے اور جامع اموی اس کے عین پیچھے میاں بہ بد جہیں بازار میں سے جانے کا رستہ
 امتیاز رکھتے تھے۔ کبھی پٹھانے والی گئی ہیں۔ کبھی زلیلات والے بازار ہیں۔ کبھی
 سودینز کی دکانوں پر۔ ہم نے کہا۔ یا شیخ میں کچھ نہیں خریدنا۔ جامع اموی
 چل اور سلطان صلاح الدین ایوبی کے مقبرے چل اور حضرت بلال حبشی کی قبر پر
 سے چل اور مدرسہ عالیہ اور امام غزالی۔۔۔۔۔

یہ شخص بھڑ میں ایسا طرارے بھرتا ہوا چلتا تھا کہ تعجب ہوتا تھا یا پھر لوں
 طرارے بھرتے ہم نے ایک پر مرد مفتاد سال کو تاہرہ میں دیکھا تھا جو اپنے لٹنے
 کہتے اور سفید داڑھی اور غاسے میں چچ کچ کا نہیں بلکہ مالی ووڈ کی کسی لفیل

قسم کی غم کا کردار لگتا تھا۔ ایک زقند میں بیس سیڑھیاں اتر گیا تھا۔ ہم میاں ہڈ ہڈ
 ... بریک لگاتے تھے۔ رفیقی لا تسرع۔ لا تسرع۔ یعنی میاں باندھ کے
 پل۔ لا تسرع (جلدی مت کر) کا لفظ ہم نے آج ہی سیکھا تھا۔ دمشق کے
 راستے میں ایک ٹرک ہمارے آگے آگے تھا۔ اس کی پشت پر لکھا تھا جیسے ہمارے
 ہاں لکھا رہتا ہے۔ "ارن دے کر پاس کریں" یا "سلمان سو برس کے ہیں کل کی
 خبر نہیں" وغیرہ۔ مطلب ہم نے "لا تسرع" کا اس لئے نکال لیا کہ اس وقت
 ہمیں عربی آرہی تھی۔ ہم مس فریال سے گفتگو جو کر رہے تھے۔ اب رہی سہی میاں
 ۱۱ پر صرف ہو رہی تھی۔

اور آخر پہلے مشکستہ عراقی دروازے نظر آئے۔ دیواریں بچھت کے جاتے
 یہ پرانے سؤقی حمیدیہ کی باقیات تھیں یا مسجد کا باب اول۔ اس کے بعد مسجد کا
 دروازہ۔ نعلین کو در بغین کیا۔ ایک شخص دوڑا دوڑا آیا۔ مسلمان؟ پاکستان؟
 ہم نے جی میں تو کہا کہ میرے دین و مذہب کو تم پوچھتے کیا ہو اس نے تو !
 لیکن بظاہر یوں گویا ہوئے کہ دریں چہ شک۔ الحمد للہ۔ کیا ہم صورت
 سے مسلمان نہیں لگتے؟

حضرت عیسیٰ کا سارہ جامع و شفیق



ایک شام ماضی کی محرابوں میں

”مکتف بدوم پر مزارِ حضرت یحییٰ علیہ السلام در جامع دمشق“

یہ شیخ سعدی کی آواز تھی جو بچپن سے ہمارے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ان الفاظ سے گلستان کی ایک حکایت کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ مزارِ صحنۂ مسجد میں نہیں بلکہ عین مسجد کے اندر چھت کے نیچے ہے اور ننگ مرمر کی جالی سے گھرا ہوا ہے اور اس پر ایک بنر گنبد ہے اور ہر چار طرف ہمہ وقت کچھ نہ کچھ لوگ یہاں مکتف رہتے ہیں۔ ہم نے بھی یہاں چند سے اوقات کیا۔ یہ شیخ سعدی کے وسیلے سے شرح صدر کی دعا مانگی۔ میاں ہر ہر بھی ہمارے ساتھ دو زانو ہوئے۔ خدا اجل نے اٹھولنے کی دعا مانگی ہوگی۔ ممکن ہے یونہی اٹھا اٹھائے ہوں۔ کیونکہ انھیں ہر سیاح کے ساتھ اٹھانے پڑتے ہوں گے یا پھر یہ کہا ہوگا کہ یا مولا اس اجنبی کے دل میں آج شام سخاوت ڈال۔ اس کے اٹھوں اور بٹوسے میں برکت دے۔ اس کی دعا تو اگر اس نے یہی مانگی تھی ایک واجبی حد تک منظور ہوئی۔ ہماری دعا کا نتیجہ ابھی نکلنا باقی ہے۔

مسجد کے اندر دو تین جگہ وعظ بھی ہو رہا تھا۔ مسجد پر آنتی پالتی مارے ایک بزرگ اسلام کی عظمت ماضی کا قصہ کہہ رہے تھے۔ لوگ کھڑے کچھ بیٹھے سُن رہے تھے۔ بعضے اٹھ کر دوسرے داعظ کے موکھین میں جا شامل ہوتے تھے۔ جو شمالی جانب کے دروازے کے قریب بیٹھا رمضان کے فضائل بیان کر رہا تھا۔ چھت اونچی اور شاندار ہے۔ لیکن زیادہ پرانی نہیں ہے کیونکہ اس مسجد کو ان صدیوں میں بار بار شکست و ریخت اور طوفان غارت و آتش میں سے گزرنا پڑا ہے۔ اب ہم جنوبی جانب کے وسیع برآمدے میں نکل آئے اور جو تاپہن صحنۂ مسجد میں سے گزر مشرقی دروازے کی طرف آتے۔ گویا یہاں صحن مسجد میں جو تاپہنا جا سکتا ہے۔ مسجد کے مغربی دروازے کے ساتھ اہم غزالی کا مکتب تھا۔ ہم نے اپنے خضر راہ سے اس کا نشان پوچھا لیکن وہ کوئی تاریخ تھوڑی پڑھا تھا۔ اس کا کام تو اڈنے سے مسافروں کو گھیر گھار کر ہونٹوں میں پہنچانا تھا۔ صحن میں پاڈ لگ رہی تھی۔ مرمت ہو رہی تھی۔ اور بارکش کی پھسلن تھی اور ہمارے جوتے چکنے فرش پر رہے جا رہے تھے لیکن میاں ہند ہمارے لاتسرع۔ لاتسرع پر کان دھرے بنا برابر پکے جا رہے تھے مشرقی دروازے سے نکلیں تو باہر پھر اونچی شکستہ محرابیں دکھائی دیتی ہیں۔ انھوں نے ہالو کی یورش بھی دیکھی ہوگی۔ تیمور کی بھی۔ یہیں وہ مشرقی منارہ ہے جس پر ایک روایت کے بموجب قیامت کے روز حضرت عیسیٰ علیہ السلام اتریں گے۔ بائیں ہاتھ کو مڑیے تو سلطان صلاح الدین غازی کی تربت کا قبہ سامنے تھا۔ ایک چھوٹے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ وہاں ایک بزرگ بیٹھے قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ ایک نوجوان نے اٹھ کر دوسرا دروازہ کھولا۔ اور سامنے اس فاتح کی آرام گاہ تھی۔

جس کے پرچم کے اگے مشرق اور مغرب سرنگوں تھے۔ جس نے یرپ کے متحدہ
شکروں کا سامنا کیا اور اپنی فتوحات اور حسن اخلاق کی داستانیں چھوڑ گیا۔ آج
جبکہ سرزمین شام کے ایک کونے اور بیت المقدس کو غاصبوں نے دبا رکھا تھا اور
فلسطین کے مہاجر صحرائیں در بدر پھر رہے تھے۔ یہ فاتح لمبی تانے سورا تھا ہم
نے کہا اے غازی! اٹھ کہ تو اب نہیں اٹھے تو کب اٹھے گا۔ کیا خوب تیامت
کا بھی ہوگا کوئی دن اور؟

فاتحہ سے فارغ ہو کر ہم پھر نکلے۔ گھوم کر مغربی دروازے سے دوبارہ مسجد میں
داخل ہوئے۔ اب گائیڈ صاحب باہر کھڑے رہے۔ ہم نے پھر ایک بار نگاہوں کو
اس رواق کمنے کے نظارے سے سیراب کیا۔ ایک بار پھر مزار حضرت یحییٰؑ پر بیٹھے اور
تصور کیا کہ ہمارے شیخ حضرت سعدی علیہ الرحمۃ بھی یہیں کہیں متکلف ہوتے ہوں
گے اور اس سامنے کے دروازے سے وہ لولا لنگڑا آدمی داخل ہوا ہو گا جسے دیکھ
کر شیخ اپنے پاؤں میں جوتانہ ہونے کا غم بھول کر رب کا شکر ادا کرنے لگے کہ
جوتانہ سہی میرے پاؤں تو ہیں۔ ورنہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاؤں
نہیں۔ ہم نے بھی شکر ادا کیا کہ ہوس کی تو انتہا نہیں۔ تمام ازل نے ہمیں پہلے ہی
ہمارے حق سے زیادہ دے رکھا ہے۔

باہر مایاں + اپنی لمبی چوڑی نکالے ہمارے منتظر تھے۔ ہم ایک بار پھر
سوق حمیدیہ کی طرف چلے اور اس کے دروازے پر پہنچ کر ہم نے اسے کچھ سے بلا
کر رخصت کیا کیونکہ ہم تو اس شہر کے درو دیوار سے باتیں کرنے آئے تھے یہاں

یاجت کے تھنے پلنے نہیں آئے تھے۔ ہمیں حریر اور زری کے سالن نہ خریدے تھے۔
 بڑے بازار کی چھت تو قدیم نہیں ہے اب تو اسے لوہے کی چادروں سے پانا
 لیا ہے لیکن ایک بغلی لگی ہیں ہمیں محرابوں کا ایک سلسلہ نظر آیا اور ہم نے اس میں
 غوطہ مارا۔ اس وقت شام اتر رہی تھی۔ روزہ دار اپنی دکانوں کو بیٹھے لگے تھے اندھیرا
 لگیوں کو زیر و نمبر کے نیلے بلب ایک آسپین سا اجالا بخش رہے تھے۔ دہنی طرف
 کو ایک بڑا دروازہ نظر آیا۔ یہ مدرسہ ناصر یہ تھا جس کی بنا سلطان صلاح الدین ایوبی کے
 بھائی سلطان ناصر الدین ایوبی نے رکھی تھی۔ آگے گلی اور تنگ ہو کر دہنی طرف کو مڑ گئی
 تھی دونوں طرف کی بالکینوں کے جھروکے ایک دوسرے کو چوم رہے تھے۔ یہ پرانے
 جھروکے اڑواڑوں پر قائم تھے لیکن نیچے کی ڈیڑھیاں اور محرابیں اور حلقے سب
 قدیم تھے چوٹی دروازے بھی عہدِ پاشاں کی کمانیاں کہتے تھے یہ تھا امویوں کا دمشق۔

دمشق اس وقت بھی آباد تھا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دین حق کی منادی
 کی۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمانؑ کے عہد میں بھی یہ رونق پر تھا۔ آشوریوں
 اور ایرانیوں کے رایت بھی اس کی فصیلوں پر لہرائے اور سکندر اعظم کے بعد اہل مقدسہ
 بھی یہاں اپنا سکھ چلا گئے۔ چودھویں سنہ ہجری میں خالد بن ولید کے ہمراہ عبیدہ بن
 جراح اور یزید بن ابی سفیان کے ہاتھوں یہ فتح ہوا۔ خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کے عہد
 میں اس کی حکومت امیر معاویہ کے ہاتھ میں تھی اور سترہ سو سے یہ امویوں کا پایہ
 تخت اور تمام دہلی سلطانیہ کا مرکز بن گیا لیکن یہ طرہ امتیاز اس کی دسار میں فقط
 صدی بھر کو رہا۔ مصر میں خلافت عباسیہ منتقل ہونے کے بعد کبھی یہ مصر کے تابع

رہا۔ کبھی بغداد کے۔ بلوچیوں کی بعض شاخیں بھی اس پر کچھ دن حکومت کر گئیں اور پھر دہان و صلیب کے معرکے برپا ہونے شروع ہوئے۔ یہ مدرسہ ظاہر یہ ہے جس کے اندر ملک الظاہر کا مقبرہ ہے۔ یہ مدرسہ عالیہ ہے۔ جہاں ابن خلکان در کس میٹے تھے یہ مدرسہ افتائیہ ہے۔ یہ مدرسہ ڈیوڑھیاں اور محرابیں۔ محرابیں اور طاق جن میں کوڑا کرکٹ کے ڈیسر ہیں اور ڈیوڑھیاں جن میں سے اندھی اندھی لگیاں جلنے کہ بھر نکل گئی ہیں۔ بظاہر لگی بند معلوم ہوگی۔ سامنے ایک دکان نظر آئے گا لیکن بس وہیں سے خم کھا کر کسی طرف کو نکل جائے گی اور پھر محرابوں کی بھول بھلیاں میں گم ہو جاتے گی۔ کہیں چند بیڑھیاں اور پھر ڈھلان لگی اوپر ہی اوپر۔ اور پھر ایک تختہ پتھر اتر جائے۔ اس بھٹ پٹے میں ساری لگی ہیں بس ایک بچہ کھڑا تھا۔ بولا مر جا۔ ہم نے کہا: جیتے رہو نور نماں۔ ان محرابوں کے بچوں بیچ کو لگیاں ہیں جن میں کہیں کوئی ٹن گرے ہے کہیں بوسے کا کباڑی ہے۔ کہیں کوئی درزی کپڑے ہی رہا ہے کہیں آگ پر سادار چڑھا ہے اور سامنے کچے پھیلے ہیں۔ ایک جگہ بغیر چراغ جلائے اندھیرے ہی میں ایک بڑا سا موچی اپنے یا کسی اور کے جوتے میں کیلیں ٹھونک رہا تھا۔ اب روزہ کھل گیا تھا۔ دکانیں بند ہو گئی تھیں۔ اور شیشے کے گواڑوں کے پیچھے لوگ میز کے گرد بیٹھے افطار کر رہے تھے۔ حلق یعنی کابل چنے کی کھٹائی دار دلال میں چمچ چل رہا تھا۔ یہ دمشق تھا۔ دمشق کا دمشق۔ پرانی داستانوں کا دمشق۔ الف یسوی دمشق۔ ایک لگی میں ہم نکلے تو بس ایک دکان ایک بزاز کی کھلی تھی۔ میپ کی روشنی میں بیٹھا حساب لکھ رہا تھا۔ سامنے لگی کے۔ اس طرف ایک آدمی ڈھکی ہوئی گنبد دار عمارت کھڑی تھی۔ ہم نے پوچھا: کیوں میاں جی یہ مسجد ہے؟ بوسے ہاں۔ ہم نے کہا۔ نام اس کا کیا ہے معلوم ہوا۔ یہ

سلطان صلاح الدین کے آقا سلطان نور الدین شہید کی مسجد ہے اور اسی کے اندر اس کی تربت ہے۔ ڈیوڑھی بے چراغ تھی۔ ہم دبے پاؤں اندر گئے تو صحن میں بھی کوئی نہ تھا اس صحن سے پرے ایک دروازہ تھا اس کے پیچھے شاید کوئی ہوگا۔ ہم نے وہیں سے فاتحہ پڑھی اور اٹے پاؤں لوٹ آئے۔ رات اتر آئی تھی۔ چل حسرت و گھراپے سانجھ بھئی چڑیس۔ لیکن میں تو کوئی جلدی نہ تھی۔ ہم تو ان گلیوں میں گم ہو جانا چاہتے تھے جذب ہونا چاہتے تھے، یہاں کسی گائیڈ کی حاجت نہ تھی۔ گائیڈ تو رستہ ڈھونڈنے اور پتہ رکھنے کے لئے ہوتا ہے۔ گم ہونے اور بھولنے اور اپنے آپ کو کھونے کے لئے گائیڈ کی کیا حاجت۔ اور پھر ہم ان تاریک کچڑ بھری گلیوں میں گم ہو گئے۔ کچھ یاد نہ رہا کہ کدھر کو جانا ہے۔ یہی گندی کچڑ بھری گلیاں ہی تو ہمارے دماغ سے ہمارا رشتہ تھیں۔ ایک جگہ پھر کسی مدرسے کی ادنیٰ ڈیوڑھی نظر آئی۔ ہم نے نام پڑھنے کے لئے اچس جھائی لیکن کچھ نہ پڑھ سکے۔ گلی درد درد تک سنسن تھی۔ ایک جگہ چراغ جل رہا تھا۔ دباغ ایک آدمی ایک پیالہ لئے ہوئے نکلا اور پیشتر اس کے کہ ہم اس سے پوچھتے یا رفیقی، لیکن سا مکتب ہے۔ دوسری گلی میں غائب ہو گیا۔ اور پھر اندھیرے سے مسجد اموی کے مینار پیدا ہوتے اور ہم نے حساب لگایا کہ ہم اس کے جنوبی دروازے پر نکل آئے تھے۔ یہاں ایک چوڑا تھا۔ چوڑا تو نہیں ایک بچی دیوار تھی۔ پرانے وقتوں کے کسی پشتے کا حصہ۔ ہم ٹھیکسی لینے کو رنگ گئے بیٹھ گئے۔

اور پھر اس پشتے کے نیچے سے کوئی بولا: یہاں ایک مندر تھا میں اس مندر

کی آخری اینٹ ہوں۔ اس کے اوپر کارڈا بولا۔ میں اس کلیسا کی دیوار ہوں جو رومن
 قیصر آرتھریس نے اس مندر کی جگہ پانچویں صدی عیسوی میں بنایا اور پھر اس کے اوپر
 کے پتھر بے۔ ہم اس خانہ خدا کے قدیم پتھر ہیں اور ہمیں پہلی صدی ہجری میں ولید
 بن عبد الملک بن مروان نے یہاں جمایا تھا۔ بارہ ہزار کاریگر اور معمار اور سنسکرت
 بلا دروم سے آئے تھے اور شب و روز کام کرتے تھے۔ ایک کے بعد ایک سلطان
 خلیفہ، پاشا، صوفی، درویش، متکلم بیان آکر مسجد ریزہ ہوتے۔ ناگیاں شور مارتھا۔
 فصیلوں پر چلو، فصیلوں پر چلو۔ یورپ کے تہران صلیبی پرچم لئے منزلیں کرتے
 یہاں آپہنچے تھے۔ یہ فرانس کے لوئی ہفتم کا لشکر جہاد ہے وہ جرمن کے قیصر
 گوناڈ سوم کے زرہ پوش نائٹ گھوڑے بڑھاتے آرہے ہیں۔ فصیلوں پر چلو۔
 فصیلوں پر چلو۔ محاصرہ۔ تیغوں کا رن پڑتا ہے۔ منجیق تپتی ہیں! اللہ اکبر
 اللہ اکبر۔ اور پھر یہ بادل چھٹ جاتا ہے۔ اب یوہویوں کا دور دورہ ہے۔ سلطان
 صلاح الدین اپنے ہمنم پر سوار تشریف لاتے ہیں۔ گلیوں میں ٹھٹ لگے ہیں۔
 نقارہ بجاتا ہے۔ یوہوی پرچم کھلتا ہے اور کھلتا چلا جاتا ہے اور بیت المقدس کو
 اپنے سایے میں لے لیتا ہے۔ اور پھر یہ نقارہ کسی اور قسم کے شور میں دب
 جاتا ہے۔ یہ کیا ہوا یہ کیسے جوم ہیں۔ یہ سلطان غازی کی میت لحد میں اتاری جا رہی
 ہے۔ کل من عیسا نان۔ کل من عیسا نان — لیکن دیکھو یہ پھر گھوڑوں کی ٹاپوں
 کا شور گونجا۔ فصیلوں پر چلو۔ فصیلوں پر چلو۔ یہ ہلاکو خاں کی فوج بے اناں ہے۔
 گلیوں، محرابوں، ڈیوڑھیوں کے دروازے بند ہو گئے۔ اور پھر ہلاکو خاں فصیلیں حیر
 کر چڑھ آیا اس مسجد کو جلا دو۔ ڈھیر کر دو۔ یہاں ہماری منہ بچھا دو اور پھر مسجد کی

پھت جلتے گی۔ ڈھیر ہو گئی۔ دمشق کے آسمان پر دھواں ہی دھواں پھیل گیا اور جب مطلع صاف ہوا تو ہلاکو بے نشان ہو چکا تھا۔ ایمان والوں نے مسجد پھر کھڑی کر دی تھی۔ ایک بار پھر مشرقی منارے سے پچاس ٹونوں نے ٹی کر اذان دی پھر مدرسے کھلے لیکن یہ دمشق تھا۔ ابھی اسے اور روندنا جانا تھا۔ اب تیمور لنگ کی باری تھی۔ پھر فیصل شہنشاہ ہوئی۔ جبل بجا۔ روایت کھلا اور دمشق غارت ہوا اور پھر مسجد سے شعلے بلند ہوئے اور اس کی لہڑی محرابیں اور دیواریں باقی رہ گئیں۔ یہ لشکر لوٹا تو دمشق کے بے مثال قلعین باغوں کو بھی ہالکتا ہوا ساتھ لے گیا۔ ان کو ماویا انہر میں آباد کرو۔ دمشق کو اجاڑ دو۔ لیکن مسجد پھر کھڑی ہوئی دمشق پھر آباد ہوا حتیٰ کہ سلطان سلیم اول نے اسے تسخیر کیا۔ ایک کے بعد ایک سلطان کے نام کے خطبے یہاں پڑھے گئے۔ اور آخر ترکوں نے بھی گھوڑوں پر زمینیں لیں اور رخصت ہو گئے۔ پھر ایک دھواں دھار جنگ ہوئی۔ پھر فرانسیسی ان گھیدوں میں دندنانے لگے۔ لیکن یہ محرابیں یہ ڈیوڑھیاں یہ آثار کوئی دشمناسکا۔ دمشق تو گنج شہیدان ہے چلو فاتحہ پڑھو۔ حضرت بلال حبشیؓ کے مزار پر۔ عبداللہ بن مکتومؓ کی تربت پر۔ عمر بن عبدالعزیزؓ کی قبر پر سیدہ زینب۔ سیدہ سکینہ۔ اسماء بنت ابوبکر۔ سیدہ فاطمہ صغیرہ بنت امام حسینؓ ان قبرستانوں کے پھیلے ہوئے لکھنڈوں میں کس کس موتی کو تلاش کرو گے۔ اور پھر ایک طرف سے تلاوت کی شیریں آواز آئی شروع ہوئی۔ اے دمشق رخصت۔ اے جامع اموی۔ اے عظمت رفتہ کی مسجد گامہ السلام لیکن ابھی کہاں۔ ابھی تو دمشق کی گلیاں باقی ہیں۔ ہم نے سڑک پار کی اور ویدیش پاشا کی تربت کے پاس سے لاداکاٹ کر پھر اندھی گھیدوں کی محرابوں میں گم ہو گئے۔

جونہ سے طرابلس تک

یہ بیروت ہے اور یہ بیروت میں ہماری آخری شام ہے اور خدا کو منظور ہوا تو
ہمارے سفر کی آخری شام بھی۔ بیروت کا طوفانی سمندر دور آؤں سے بے طرح شور
کرتا ہے اور ہمیں اپنے ساحل پر بٹا رہا ہے جہاں آج کل شام کو دُور دُور تک کوئی
متنفس نہیں ہوتا۔ گرمیوں کی شاموں کو میں ہم نے لوگوں کے میلے دیکھے تھے۔
ترہیز، جھٹھے اور زمان پکتے پاتے تھے۔ آج نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں۔ نہ وہ حسن
میں رہیں شوخیاں۔ یا تو موسم کے ساتھ رخصت ہو گئیں یا چار دیواریوں میں،
دیوان خانوں میں محصور ہو گئیں۔

شام ہے۔ تاریکی ہے۔ ابر ہے۔ بوندیں برس رہی ہیں تھوڑے تھوڑے
وقفے سے بادل بھی گرج اٹھتا ہے اور اس طوفان کے باوجود دُور ابر کی ڈوٹریوں
کے درمیان سے جانے کس تاریخ کا چاند جھانک رہا ہے۔

وہ سامنے حویلی کی پہاڑیاں نظر آتی ہیں اور اس کے دامن میں جونہ قریہ ہے
جہاں ہم نے پچھلے ہفتے ایک دن گزارا تھا۔ بس حلا الشیخی کرناں ہماری رفاقت

پر مامور ہیں اپنی کار سے آتی تھیں اور منزل ہماری المکتبہ البوسیدہ تھی یعنی سینٹ پال پبلنگ ہاؤس۔ سینٹ پال ہوٹل سے سینٹ پال کچتے تک ... جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔ سوئے دار کی رعایت سے اس کچتے کی چھت پر صلیب بھی نصب تھی۔ اور اس کے پیچھے کا پاڑ بھی کلیساؤں اور صلیبوں سے پٹا تھا اور حریصا کے پاڑ کی چوٹی پر ایک عیسائی دیوی کی بہت بڑی شبیہ تھی جس پر رات کو اس انداز سے روشنی ڈالی جاتی ہے کہ سارے میں ہی چھپاتی دکھائی دیتی ہے۔ دوسرے گرجاؤں کی صلیبیں بھی رات کو روشن ہو جاتی ہیں کسی مسجد کا مینار ان پاڑیوں پر ہمیں نظر نہ آیا۔

جو یہ ہیں ہم نے مین کنارہ بھر پر مہربان اور شفیع اور یہ پوش فادر جورج ہالکی کے ساتھ کھانا کھایا اور لستی پی۔ ہماری نظر جو فراز کوہ کی طرف اٹھی تو بوئے چوگے اوپر؟ ہم نے کہا: کیسے؟ بوئے۔ بھلی کے جھوٹے میں بیٹھ کر۔ جھوٹے میں بیٹھ کر لوہے کے تاروں سے ٹلکے پاڑ چڑھنے اترنے کے مواقع ہمیں جاپان میں بھی ملے اور سوئٹزرلینڈ میں بھی۔ لیکن ہم نے ان سے فائدہ نہ اٹھایا۔ یہاں ہم نے اپنا جی کڑا کیا اور کہا: ہاں کیوں نہیں۔ فادر ہالکی کے ایک جوان ساتھی نے جھوٹے میں چڑھنے سے انکار کر دیا کہ مجھے تو ہول آتا ہے۔ بس سلاشینبی بھر چر کر کرتے ہوئے شرما شرما چارے ساغھ سوار ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد جب انھوں نے نیچے جھانکا اور زمین کو سخت آسمان کو دُور پایا تو اُن کا دل بھی ڈوبنے لگا۔

اور خوف کے مارے ہمارا اچھ پکڑ کر ہم سے ہٹ کر بیٹھ گئیں۔ یہ مقام خطرناک ہے۔ اسی پر گھٹا دو دن تو برے سے — کی دعا کا تھا۔ لیکن ہم جو جہاز

میں جیسے کبھی نہ گھبرائے تھے۔ یہاں محض فادر اور مہں حلا کو دکھانے کے لئے ہنس
ہنس کے باتیں کرتے رہے۔ پچ یہ ہے کہ دل بھارا بھی بیٹھا جا رہا تھا۔ چڑھائی
اتنی زیادہ اور مسافت ایسی خاصی ہے کہ اوپر سے یہ بھی مشکل سے نظر آتا تھا کہ ہم
کہاں سے چلے تھے۔ اب ہم قلعہ کوہ پر تھے فادر ہمیں پاس کے گرجا میں لے گئے
جس کے اوپر لبنان کی سب سے بڑی مورتی ہے۔ اسے شرمیوت کی محافظ کہا جاتا
ہے۔ یہ گرجا عجیب و غریب ساخت کا تھا اور یہاں سے گرد و نواح میں بیس بیس
میل دور تک دیکھا جاسکتا تھا۔ فادر نے صلیب کا نشان بنایا۔ ہم ہلال ولے کھڑے
دیکھتے رہے۔

جن پیشروں سے ہم ملے اور بیروت کے پیشتر تو ایک صدی سے مشہور ہیں
ان میں سے بیشتر عیسائی ہیں۔ انہی نے پرانا عربی ادب چھاپا ہے اور اسلامی کتابیں
بھی۔ یہ لوگ لبنان کے نوکشور ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ یہ کتابیں بہت خوبصورت
چھاپتے ہیں۔ مولوی محبوب عالم نے اپنے سفر نامے میں بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ وہ
مطبع الکا تو لیکہ اور مطبع آبائے یسوعیت میں گئے تھے اور ڈھیروں کتابیں خریدی
تھیں۔ ہماری عربی کسی قابل نہ تھی پھر بھی ہم نے کچھ کلاسیکی شاعروں کے دیوان
لئے۔ دیکھ کر آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔ بیروت کے دوسرے کاروباریوں کے
بورڈ پڑھئے تو بھی غالب اکثریت عیسائیوں کی نظر آئے گی۔ مسلمانوں کا دعویٰ
ہے کہ ان کا تناسب اب عیسائیوں کے برابر ہے۔ مولوی محبوب عالم نے ۱۹۰۰ء
میں لکھا تھا کہ شہر میں مسلمان فقط ایک چوتھائی ہیں۔ عربی زبان سے محبت اور
اسرائیل کی مخالفت میں ہم نے ان عیسائیوں کو مسلمانوں سے کم شمیر رہنے نہیں پایا۔

اگے روز اسی راستے ہم طرابلس گئے تھے۔ طرابلس دو ہیں۔ ایک طرابلس الغرب جریڈیا میں ہے اور ایک یہ کہ ایمازک کے لئے طرابلس الشام کہلاتا تھا۔ یہ لبنان کے انتہائے شمال میں ہے۔ اس کے بعد شام کی سرحد پار کریں تو حلب کے نواح میں جا پہنچیں گے۔ اسی ساحلی سڑک پر جرنینہ سے کچھ اگے ببلوس کا قدیم شہر ہے۔ جہاں دنیا کے پہلے حروف تہجی ایجاد ہوئے اور زبان نے تحریر کا روپ پایا۔ لبنان قدیم زمانے میں فونیشیا کہلاتا تھا۔ اور یہاں کے لوگ فنیقی دنیا کی قدیم تہذیبوں میں ممتاز و بزرگ تھے ہیں۔ یہ سمندری طاقت تھے اور ان کے سفینے روم اور کارتھج تک مار کرتے تھے۔ ببلوس کے نئے شہر کے پہلو میں پرانے آثار میں سے کچھ توپار اور پانچ ہزار سال پہلے کے مندروں کی باقیات ہیں جن کے گرد تین ہزار سال قبل مسیح کی تفصیل کا کچھ حصہ اب بھی کھڑا ہے۔ عین ساحل پر ایک فرنیش قلعہ ہے۔ صلیبوں کے زمانے کا۔ ولادت مسیح سے چار ہزار سال قبل یہ شہر سواحل فونیشیا کا دارالظہر تھا اور بابل کا نام اس شہر کے نام ببلوس سے مشتق ہے اسے دنیا کا قدیم ترین شہر بھی کہتے ہیں۔

طرابلس کو اصل میں تریپولی یعنی ”سہ شہر“ ہے۔ قدیم زمانے میں صدر صید اور اردو تین شہروں کے مہاجرین نے آباد کیا تھا اور ہر جماعت علیحدہ محلہ اور قصبہ کے اندر رہتی تھی۔ رومیوں کے عہد میں یہ بڑا سربراہانہ شہر تھا اور مسلمانوں کے عہد میں بھی یہاں سے ریشم اور برتن و سادہ کو جاتے تھے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی اور سلطان برکس نے اس کا محاصرہ کیا، آخر سلطان قلاوون نے اسے فتح کیا۔ یہاں صلیبیوں نے کا ایک قلعہ۔ جامع۔ بہت سے پرانے مدرسے اور کتب خانے۔ بارہ پرائی صلیبی

خانقاہیں اور تجارت کے بازار ہیں۔ نیا طرابس توجیدہ ستر ہے لیکن رانا ستر اپنے مکتبوں، جامعوں اور محراب دارگیلوں کے ساتھ چھوٹا دمشق کمانے کاستی ہے۔ ہم قلعے کے دروازے پر پہنچے تو اسے بند پایا۔ کچھ بچے کہیں رہے تھے ان کی زبان ہمارے اور ہماری ان کے پلے نہ پڑی۔ اتنے میں ایک نوجوان باسکٹ چنے آتے دکھائی دیئے۔

ہم نے پوچھا: انٹریزی دیتے ہو؟

جواب ہا: ہاں بروتا ہوں۔

بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی انٹریزی آٹھ دس نفیوں تک محدود تھی۔ نام ان کا احمد تھا۔ بوئے اردو بھی بول لیتا ہوں۔ ہم نے کہا: بولو، فرمایا: بہت اچھا۔ پتہ چلا کہ ان کو یہی لفظ آتا ہے۔ بہت اچھا۔ جانے کہاں سے سنا تھا۔ یہ بیچارے بہت جیسے آدمی تھے۔ انھوں نے قلعے کے دروازے پر جا کر بااٹلی کو بہت آوازیں دیں لیکن آج بابا علی نے چنار روزہ ہونے کی وجہ سے جلد دروازہ بند کر دیا تھا۔ احمد میاں نے کہا: اب آپ شہر جائیے، چھ بجے کے بعد آئیے اُس وقت بابا علی کا بھی چاہا تو آپ کے لئے دروازہ کھول دے گا۔ آپ ایک آدھو ییرانڈر کریں تو دروازے کا کھٹا بڑی حد تک یقینی ہے۔

ہم نے کہا۔ اچھا، اب میں بازار کا رستہ بتاؤ۔ بازار تو ہم پہنچ گئے لیکن وہ بھی بند ہو رہا تھا۔ طرابس کی یادگار کے طہر پر ہم نے کچھ خریدنا چاہا۔ سلسلے کبلوں کی دکان تھی۔ ہم نے ایک کبل لیا۔ بھاؤ تاؤ کی گنجائش نہ تھی کیونکہ دکاندار افطار کے لئے گھر جانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ بھاؤ تاؤ کرنا ہے تو کل صبح آئو۔ ناچار

ہم نے پیسے دیئے اور کبیل کو بغل میں مارا۔ میاں میاں احمد بھی سلام عیدک کر کے ہم سے رخصت ہو گئے۔ اور ہم طرابلس کی گلیوں میں گھومنے کے لئے تیار ہو گئے۔

اس مسافت میں ہمارا کبیل بہت خلل انداز ہوا۔ ہم اسے ایک بغل سے دوسری میں منتقل کرتے رہے حتیٰ کہ ایک بار تو ہم اسے چھوڑنے پر بھی آمادہ ہو گئے تھے لیکن اب یہ ہمیں نہ چھوڑنا تھا۔ طرابلس میں دیکھنے کی چیزیں تو بہت ہیں لیکن وقت کہاں تھا۔ درسوں اور مسجدوں اور محرابی بازاروں میں تو ہم بھٹکے اور دُور دُور تک گئے لیکن قلعہ نہ دیکھ پائے۔ معلوم ہوا صبح دم دروازہ خادہ کھلے گا تو یہ بھی کھلے گا۔

پہلے خرد گھر اپنے سانجھ جی چور دیں۔ یہ تین مہینے بڑی مشکل سے تمام ہوتے ہیں اور ہم بغداد کا پروگرام منسوخ کر کے سیدھے کراچی آرہے ہیں کیونکہ اے ہماری گفتوں، عشرتوں اور حسرتوں کے شہزادہ ہم تجھ سے دُور نہیں رہ سکتے۔ آوارہ گردی سے ہم نے اپنے دامن میں دیس دیس کی خاک تو جمع کر لی ہے لیکن ہمارے دُور دُور ہیں کہ جو تھے۔ اور دریاں دہی ہیں کہ جو تھے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی دیکھا۔ یہ دریائے سین ہے۔ یہ ٹیمر ہے۔ یہ مین ہے۔ یہ رائے یہ ایسٹر۔ یہ رہی حنیوا کی بھیل۔ اور یہ ہے زیورخ کا بحیرہ۔ دریائے ولتاوا۔ دریائے دستا۔ دریائے ڈینیوب۔ دریائے نیل اور اب بحیرہ مدیم پانی ہی پانی اس کے باوجود پیاس ہی پیاس۔

یہ کیا صد کانوں میں آرہی ہے۔ گر جا کا گھر مال ہے۔ یا بالاب رحیل ہے۔ اے مسافر اپنے آخری پڑاؤ سے اٹھ۔ الود بجا اور کجا ہے میں زاد سفر دکھ کہ آج

تیرا قافلہ جاتا ہے اے بلاد مغرب کے شہر و خدا حافظ۔ اے پریس کے چوک۔ لندن کی ٹیکس۔ برلن کی سڑک۔ ایمسٹرڈم کے بازار۔ جنیوا کے مناو۔ برن اور لوسرن کے بسزہ زار۔ پراگ کے قلعہ۔ وارسا کے خرابو۔ ویانا کی عسراؤ۔ قاہرہ کی مسجد۔ دمشق کے مکتبہ اور طرابلس کی محرابو الوداع اور بیروت کی روشنیو تمہیں بھی الوداع۔

آج ہم اپنے سفر کی بادہویں ولایت اور ستائیسویں شہر کو خیر باد کہیں گے۔ اے وقت تیز ترک گاڑن۔ اے گھر کی سویو۔ چلو چلو چلو۔ نسیم خوشدلی از فتح پور می آید۔ بس ایک شام اور درمیان ہے۔ پھر ہم اپنی کمر کھولیں گے۔ جوتوں سے ان رہ گزاروں کی گرد بھاریں گے۔ مسافت کے دنوں اور ہم سفروں اور مہربانوں اور میزبانوں کو یاد کریں گے۔ صحتوں کو بھول جائیں گے۔



درسہ اور مدرسہ کے شاگرد و مشق میں



چل خسرو گھراپنے

ایک بار ہمارے دوست ممتاز مفتی کے راولپنڈی سے کراچی آنے کا پرچہ لگا۔ تو ہم نے اور احمد بشیر نے ان کے خیر مقدم کے لئے لارنس روڈ سے کھن جینڈ والے کا ہاجا کر لئے پڑیا۔ پوری ٹیم لینے کی تو قدرت نہ تھی نہ ہمیں خود ڈھول پٹیا اور نفیری بھانا آتا ہے۔ بس ایک آدمی کی فیس دی۔ اس نے ترٹ ٹکے میں سے نکال کر اپنی ذرق برق جھالروار یونیفارم زیب تن کی اور ہمارے ساتھ ہو گیا۔ یہ بالکمال ایک اٹھ سے ڈھول بھانا تھا۔ دوسرے میں ٹرم پکڑے تھا۔ یہ تو دو ساز ہوئے یورپ میں تو جہاں لیسر مہنگی ہوتی ہے۔ لگے میں تاشہ کہا روں کے پالکی میں ڈھول کا حساب ہمیشہ رہتا ہے۔ ایک آدمی تین تین چار چار باجے ایک ساتھ بجاتا ہے۔ منہ والا باجہ اٹھ سے پکڑنے کی ضرورت نہیں۔ ڈھول کے ساتھ ایک کمانی لگی ہے اس میں وہ اٹکا رہتا ہے۔ ایک ذرا گردن جھکائی اور چھوٹک لگائی۔ اب دونوں اٹھ فارغ ہیں۔ ایک سے ڈھول پر چوٹ لگائیے۔ دوسرے سے جھانجھ بجائیے یا سر کھجائیے۔ بہر حال ممتاز مفتی صاحب اس جلوس میں اس ایک

نفری بینڈ کے پیچھے دو لہا بنے جو چلے تو یہ منظر دیدنی تھا۔ ہوائی اڈے کے سارے مسافر دیکھنے کو جمع ہو گئے کہ اس کردار سے یہ کس کی سواری باد بہاری جاتی ہے۔

یہ اعزاز ہماری نظریں پنڈی سے آنے والوں کا تھا۔ ہم تو پھر ولایت سے آرہے تھے اور یادوں دوستوں کو لکھ دیا تھا کہ دیکھنا زیادہ تکلف نہ کرنا۔ یہ زیادہ ہار گجرے ڈھول تاشے پاشائے وغیرہ ہمیں پسند نہیں اگر ہوں تو بس ایک حد کے اندر ہوں۔ زندہ باد کے نعرے لگانے والوں کا جلوس بھی زیادہ سے زیادہ ایک بس میں آجائے۔ ہم گوشہ گیر فقیر آدمی ہیں۔ زیادہ طسراق ہماری درویشانہ طبیعت کے منافی ہے۔ جنگ و لڑنے، ڈان و لڑنے اوریشلی ویشن والے بھی بس ایک ایک نوٹوگراف ہماری تصویر وغیرہ لینے کو بھیجیں۔ ہجوم سے ہمارا جی گھبرا جاتا ہے۔

پھر واپس آنے والوں کے خیر مقدم کے کئی طرح کے کلمات ہم نے پڑھے اور سنے تھے۔ خوش آمدید۔ صفا آور وید۔ لمے آمدت باعث آبادی ما۔ سرد سونے بوستان آید ہے۔ اہلاً وسلاً۔ جی آیاں نون وغیرہ۔ ہمارا دل بھی کراچی کے قریب پہنچ کر گداز ہو گیا تھا اور ہم نہایت رقت سے آیا شہر بھنبھور آیا شہر بھنبھور فی کاتے اور آنسو پونچھتے چلے آرہے تھے۔ اس بے تکلفی کا براہ۔ اول تو احباب میں سے کوئی ہوائی اڈے پر آیا نہیں آیا تو جکارا۔ جیسے گئے تھے ویسے ہی ہر پھر کے آگئے۔ دوسرا بولا: خیر سے بدحو گھر کو آئے۔

ایک شاعر نے تو ایک پرانے فارسی مصرعے — ”چو یاید بنوز — الخ“ سے تاریخ بھی نکالنے کی کوشش کی۔ غنیمت ہوا کہ نہیں نکلی۔

یہ سارا جی جلانے کا سامان تو تھا لیکن جب ہم نے پوچھا کہ لوگو ہاں ہے کہاں ہیں۔ جلوس کہہ رہے ہیں۔ کیا ایک آدھ بار بھی تم نہ لاسکتے تھے۔ پیسے ہم دے دیتے۔ یہ کیا تماشا ہے تو سب آئیں باتیں شائیں کر کے رہ گئے۔ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ خیر میاں آزاد۔ آج کل کے دوست ایسے ہی ہیں۔ ان کا گلہ نہ کرنا چاہیئے۔

لیکن آنے والی جہتے کم آب کو سب سے پہلے کسٹم کے پلوں کے نیچے سے گزرنا پڑا۔ ہمارے پاس ایک سوٹ کیس تھا۔ ایک اور سوٹ کیس۔ ایک تھیلہ۔ ایک اور تھیلہ اور ایک اور تھیلہ۔

کسٹم انسر نہایت مستعد آدمی تھے۔ فرمایا :

Have you anything to declare?

’ہم نے کہا: ہم خدا کو حاضر ناظر جان کر اعلان کرتے ہیں کہ گزشتہ راصلوۃ بقیہ عمر ملک اور قوم کی خدمت میں بسر کریں گے، خواہ اس کے لئے ہمیں اسمبل میں کیوں نہ جانا پڑے۔‘

’بوسے، اس قسم کے اعلان سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ آپ کے سامان میں کوئی چیز ایسی تو نہیں جو قیقتی ہو جس پر کسٹم لگتا ہو۔‘
ہم نے کہا، کیوں نہیں۔ بڑی بڑی انمول چیزیں ہیں۔ ہم نے تھیلے میں اتھ

ڈال کر ایک چتر نکالی۔ یہ تھی انگلش جرمین اور جرمن انگلش ڈکشنری۔

بے توجہی سے دیکھ کر فرمایا: ”اور کیا ہے؟“

اب کے ہم نے ماتھ ڈالا تو فرینچ انگلش اور انگلش فرینچ ڈکشنری دستیاب ہوئی۔
فرمایا: ”اس کے نیچے کیا ہے؟“

وہاں سے ڈچ زبان کی لغت برآمد ہوئی۔

اب انھوں نے تھیلے سے کر خود ٹھولا۔ اس کے نیچے چیک زبان کی لغت تھی

پولش زبان کی دوسرے بول چال کی کتاب تھی۔ اٹالین زبان کی گرامر تھی۔

بوسے، بس؟

ہم نے کہا: ”بس کیوں۔ عربی زبان کے لغات اس دوسرے تھیلے میں ہیں

ان کے علاوہ ہر شہر کی گائیڈ بک، نقشہ اور پکچر کارڈ ہیں، دکھائیں نکال کر؟“

بوسے: نہیں

اب انھوں نے ہمارے سوٹ کیس کو ٹوکا دیا اور کہا یہ بھی ذرا دیکھیں۔

وہاں بس کچھ کپڑے تھے ہمارے۔ کچھ پرانے کچھ نئے۔ ”وصلی ان وصلی

بنیائیں۔ موزے وغیرہ۔ مولوی محبوب عالم کا سفر نامہ۔ ہمارا غیر مطبوعہ دیوان۔

ایک ڈبہ ہم نے ان کپڑوں کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ ہمارا خیال تھا اس پر کسی

کی نظر نہ پڑے گی لیکن کسٹم دالوں کی نگاہیں بہت تیز ہوتی ہیں۔ انھوں نے اسے

کھینچ لیا۔ ہم نے کہا: ”نہ نہ۔ اسے مت کھولنے گا۔ اس میں کچھ بھی نہیں ہے لیکن انھوں

نے کھول ہی لیا۔

اس ڈبے کے اندر سے ایک اور ڈبہ نکلا۔ اس کے اندر ایک اور —

ایک اور — اب لغات شروع ہوئے ایک کے اندر دوسرا۔ دوسرے کے نیچے



تیسرا — بڑے لغافے — درمیانے لغافے — چھوٹے لغافے — سب سے اندر کا لغافہ انہوں نے کھولا۔ اس میں کچھ بھی نہ تھا۔
فرمایا: اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔

ہم نے کہا: کیوں نہیں ہے؟ آنکھوں والوں کے لئے بہت کچھ ہے۔ ہم سے پوچھتے، ہم جاتے ہوئے اپنے ہاں کی ہینڈی کرافٹ شاپ سے کچھ تحفے لے گئے تھے، ان لوگوں نے اخباریں یا براؤن پیسر میں بازو کر دیئے تھے، ہمیں بہت شرم آئی، اب یہ دیکھتے، یورپ والے کتنی عمدہ پکنگ کرتے ہیں۔ اس ڈبہ میں ہمارا سوٹ تھا اور اس دوسرے میں جوتا تھا۔ باقی لغافوں میں ہماری قمیضیں اور سوٹر وغیرہ تھے۔ اس لغافہ میں ہم ایک بارڈل روٹی لائے تھے۔ لوگ تو ایسی چیزیں بے پروائی سے پھینک دیتے ہیں، ہمارے جی نے یہ گوارا نہ کیا۔ سینٹ مینٹ کر سکتے رہے۔ اب یہ چیزیں ہم اپنے دکانداروں کو دکھائیں گے اور شرم دلائیں گے کہ تم لوگ ایسے ڈبوں اور لغافوں میں چیز رکھ کر دیا کرو تو ہم کیوں نہ ہیں۔ جب ہم ولایت میں اتنی ڈھیر ساری خریداری کرتے ہیں تو یہاں کے دکاندار تو پھر اپنے بھائی ہیں، اپنے گرامی ہیں..... یہ سارے ڈبے اور لغافے جمع کرنے اور رکھنے میں ہمیں اتنی محنت کرنا پڑی۔ جرمنی سے، انگلستان سے، لینڈ سے، سوئٹزرلینڈ سے اور آپ نے ٹکاسی زبان بولا دی کہ اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ جیسے یہ سب رومی چیزیں ہوں۔

فرمایا: جاییے صاحب جاییے،

ہم نے کہا: یہ تیسرا تھیلا بھی دیکھ لیجئے!

لوے : نہیں 'نہیں' نہیں نہیں۔ جائے۔ ہوا یہ کہ ایک اور صاحب اگر ان کے کان میں کہہ گئے کہ یہ تو فلاں صاحب ہیں۔ کیوں اپنا وقت ان پر ضائع کرتے ہو یہ بھی اچھا ہوا۔ کیونکہ ہمارے تمام میرے اور زمر و پونڈوں اور ڈالروں کے نوٹوں کی گڈیاں سونے کی انٹیں 'جر' آؤ گھڑیاں۔ سلک کے تھان 'ایم' اور کوکین وغیرہ کے ڈسے اسی تھیلے میں تھے۔

ڈاٹری لکھنے اور چھپوانے کا فائدہ یہ ہوا کہ اجاب کو اپنے متعلق عجیب طرح متفکر پایا۔ ردنی صورتیں 'سو کھے چہرے' ہمدنی لبوں پر۔ معلوم ہوا ہماری فلاکت اور بے زری کا سن کر بعضوں نے تو ہمارے لئے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا ہے ابنِ انشا ریلیف فنڈ کھول دیا ہے جس میں دیئے جانے والے عطیات پر ٹیکس بھی معاف رہے گا۔ بعض اہل درد و دلا اندازوں اور چائے خانوں والوں نے بھی جو جنگ پڑھتے ہیں۔ از خود ہمارے نام کی صندوقچیاں کونٹر پر رکھ دی ہیں۔ جن لوگوں سے ہمیں اس قسم کے تقاضے کا کٹھکا تھا کہ ہمارا ٹیپ ریکارڈ کو کدھر ہے ہمارا کیمبرہ نکالو وغیرہ۔ انہوں نے بلایں لے کر اور آنسو پی کر کہا۔ میاں تم آگئے ہو سب چیزیں آگئیں۔ بلکہ ایک مہربان نے تو ہماری دجلوئی کے لئے ایک ٹرانزسٹر بھی بازار سے خرید کر ہماری نذر کیا ہے۔